خاموش
ہتھیار

محمود ، فاروق ، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۳۲

خاموش ہتھیار

اشتیاق احمد

حدیث شریف

حضرت جبرائیلؑ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ کا پروردگار فرماتا ہے کہ اگر ہم نے آدمؑ کو صفی اللہ ہونے کا تمغۂ امتیاز دیا ہے تو آپ ﷺ پر تمام انبیاء کو ختم کر کے آپ ﷺ کی شان امتیاز سب سے بڑھا دی ہے اور میں نے کوئی مخلوق پیدا نہیں کی جو میرے نزدیک آپ ﷺ سے زیادہ عزیز ہو ــــــ

(ابن عساکر)

السلام علیکم! یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ میں ان دنوں پھر ڈاک کے طوفان میں غوطے لگا رہا ہوں، یعنی میں ہی نہیں - میرا عملہ بھی - خیر یہ کوئی نئی بات نہیں، خاص نمبر بازار میں آنے کے بعد ڈاک نہ آئے تو اور کیا ہو گا - ہم ڈاک کے استقبال کے لیے تیار ہیں اور استقبال بھی خوش دلی سے کرنے کے عادی ہیں - مصیبت تو بے چارے پوسٹ مین کی ہے - اسے پورا تھیلا الگ بھر کر لانا پڑ رہا ہے - ایک روز ایک صاحب دفتر تشریف لے آئے - اور آئے بھی ان دنوں جب خاص نمبر کی ڈاک آ رہی تھی - بڑی سویرے آئے اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے - میں نے تشریف آوری کی وجہ معلوم کی تو کہنے لگے: بس آپ اپنا کام کریں، تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا - کچھ دیر بعد ڈاکیا آیا - ڈاک کا ڈھیر میز پر لگا کر چلا گیا - تو وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے - میں نے حیران ہو کر کہا: کیوں صاحب - کوئی بات کیے بغیر ہی چل دیے - تو کہنے لگے: جو دیکھنے آیا تھا، دیکھ لیا، میرا خیال تھا، آپ ڈاک کے بارے میں ہمیشہ مبالغہ آرائی کرتے ہیں، بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں - میں نے سوچا تھا، آج آپ کو رنگے ہاتھوں شرمندہ کروں گا، لیکن شرمندہ ہو کر جا رہا ہوں - کیوں کہ ڈاک تو آپ کے بیانات سے بھی زیادہ ہے - یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئے اور میں افسوس ہی کرتا رہ گیا - کہ انھیں ایک بات تو بتا ہی نہیں سکا - چلیے وہ بات اب دو باتوں میں لکھ دیتا ہوں وہ بات یہ ہے کہ ان صاحب نے جو ڈاک دیکھی تھی - وہ صرف ایک وقت کی تھی - ڈاک دوپہر کو بھی آتی ہے - تو یہ تھیں ڈاک کی دو باتیں - ابھی آپ کو نہ جانے کتنی چیزوں کی دو باتیں پڑھنا پڑیں گی - او ہو - خاموش ہتھیار کی بات تو رہ ہی گئی - اس کے بارے میں اگر میں یہ کہوں کہ پڑھ کر آپ کے خیالات، احساسات اور جذبات اور ہی کروٹ اختیار کر لیں گے تو بے جا نہ ہو گا - آپ ایک اور اعلان بھی کرتے نظر آئیں گے - وہ اعلان کیا ہو گا - یہ میں نہیں بتاؤں گا - اس آئندہ کتابوں میں چند خطوط ان خیالات پر مبنی ضرور آپ کی نظر سے گزریں گے - دو باتیں قدرے لمبی ہو گئیں - ان میں لمبی ہی بات بُری ہے - ہے نا -

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹیسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص

اشتیاق احمد

مہمان گم

"میرا مہمان گم ہو گیا ہے۔"

"مہمان گم ہو گیا ہے۔" اُن کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"جی ہاں، اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"لیکن آپ ہمارے پاس کیوں آگئے ہیں، آپ کو تو چاہیے تھا، سیدھے پولیس اسٹیشن جاتے۔" محمود نے مُنہ بنایا۔

"یہ پُرانی بات ہو گئی۔" اس نے بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم سمجھے نہیں جناب، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ اور آپ نہیں سمجھے۔ بھئی۔ جب مہمان گم ہوا تھا، اس وقت میں نے پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرا دی تھی، لیکن چونکہ اس بات کو اب ایک ماہ ہو چکا ہے اسی لیے میں نے یہ کہا کہ یہ پُرانی بات ہو گئی۔"

"اوہو۔ تو آپ کے مہمان کو گم ہوئے پورا ایک ماہ گزر گیا

ہے" فرزانہ کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"ہاں! بالکل یہی بات ہے۔"

"اور وہ اب تک آپ کو مل نہیں سکے۔" فاروق بولا۔

"آپ نے اور بھی عجیب بات کی۔ اگر وہ مل جاتے تو میں آپ کے پاس کیوں آتا۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔" محمود بڑبڑایا۔

"کون سی بات نئی نہیں۔ کسی کے مہمان کا گم ہونا؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں، ہمارے بھائی صاحب کا عجیب بات کہنا کوئی نئی بات نہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"خیر خیر۔ یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے۔ آپ میرے معاملے پر بات کریں۔"

"آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"اس کے علاوہ کیا چاہوں گا کہ آپ میرے مہمان کو تلاش کر دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کے لیے آپ کو پوری تفصیل بتانا ہو گی۔" محمود نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ہر بات آپ کو بتاؤں گا۔"

"تو پھر شروع ہو جائیے۔ ہم سن رہے ہیں۔" محمود بولا۔

وہ اس وقت گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے، چند منٹ پہلے ہی ملاقاتی آیا تھا۔ وہ اس وقت صحن میں بیٹھے تھے، لیکن پھر ملاقاتی کے آنے پر انہیں اٹھ جانا پڑا۔ اب وہ انہیں اپنی کہانی سنا رہا تھا اور وہ غور سے سن رہے تھے، انسپکٹر جمشید ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ جب کہ ان کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔

"میرا نام رومی جنگ ہے۔ اون کا تاجر ہوں۔ کاروبار بہت اچھا ہے۔ دوسرے ملکوں کو بھی اون سپلائی کرتا ہوں۔ ایک ماہ پہلے مجھے اپنے دوست خاور بگرامی کی طرف سے فون ملا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے وطن آ رہا ہے۔ اور یہ کہ میرے ہاں ٹھہرے گا، میں نے فون پر جواب دیا کہ شوق سے آؤ۔ خاور بگرامی ایک مدت سے شارجہ گیا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بیوی بچے بھی وہیں بلا لیے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھار ہی آنا ہوتا ہے۔ اس کے تمام عزیز اور رشتے دار ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ اور اسے گاؤں میں رہنا پسند نہیں، اس لیے جب کبھی آتا ہے، میرے پاس ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا یہ فون میرے لیے عجیب نہیں تھا۔ پھر وہ مقررہ تاریخ کو آ گیا۔ میں ایئرپورٹ سے اسے گھر لے آیا۔ وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اور پورا ماہ میرے پاس ٹھہرنے کا پروگرام تھا، لیکن صرف ایک ہفتے بعد وہ کہیں غائب ہو گیا۔" یہاں تک

کہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے، انہیں اچانک انشارجہ جانا پڑ گیا ہو؟"

"جی نہیں۔ میں نے اس دن کی انشارجہ جانے والی پرواز کے مسافروں کی فہرست دیکھ لی ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ کسی اور نام سے بھی تو جا سکتے ہیں۔"

"ہاں، لیکن انہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر کوئی ضرورت پڑ ہی گئی تھی تو انشارجہ پہنچ کر تو اطلاع دے سکتے تھے، لیکن مشکل تو یہ ہے کہ وہ انشارجہ بھی نہیں پہنچے۔ میں نے وہاں بھی فون کیا تھا۔ اور اس روز سے برابر کئی مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ ادھر سے ان کی بیوی نے ہر بار یہی کہا کہ وہ ابھی تک نہیں پہنچے۔ ان کے بیوی اور بچے بھی بہت پریشان ہیں۔"

"ہوں! یہاں کی پولیس کیا کہتی ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"ان کے پاس تو بس ایک ہی جواب ہے۔ "تلاش کر رہے ہیں، مل جائیں گے۔ لیکن میں جانتا ہوں، وہ تلاش ولاش نہیں کر رہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ جس روز میں نے رپورٹ لکھوائی، اس روز ضرور انھوں نے کچھ کوشش کی تھی۔ اس روز کے بعد پھر انھوں نے کچھ نہیں کیا۔"

"اور اس روز انھوں نے کیا کوشش کی تھی؟" فاروق نے پوچھا۔

"اس ہوٹل میں پوچھ گچھ کی تھی جس میں وہ کھانا کھانے گئے تھے۔"

"کیوں۔ کیا وہ کھانا آپ کے ہاں نہیں کھاتے تھے؟"

"نہیں! انہیں گھر کے کھانے اچھے نہیں لگتے۔ وہ ہمیشہ ہوٹلوں پر کھاتے ہیں۔ انشارجہ میں بھی وہ ایک ہوٹل میں ہی رہتے ہیں، ہوٹل کا ہی کھانا بارہ مہینے کھاتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ارے! یہ تو آپ نے عجیب بات بتائی۔ ہوتا تو عام طور پر یہ ہے کہ لوگ ہوٹلوں کے کھانوں سے تنگ آئے ہوتے ہوتے ہیں اور گھر کے کھانے کے لیے ترستے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"جی ہاں! یہ بات میں نے بھی ان سے کہی تھی، مگر وہ سن کر مسکرا دیے اور صرف اتنا کہا۔ بس عادت ہو گئی ہے۔"

"وہ کام کیا آئے تھے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے پوچھا ضرور تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مختلف کام ہیں۔ کچھ لوگوں سے پرانا قرض وصول کرنا ہے۔ کچھ لوگوں کا پرانا قرض چکانا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ کہ انہیں اپنا مکان بھی فروخت کرنا تھا، کیوں کہ اب انھوں نے وطن واپس آنے کا خیال تک چھوڑ دیا تھا، لہٰذا وہ مکان فروخت کرنا چاہتے تھے۔"

"اور ان کا مکان کہاں ہے؟"

"غازی روڈ پر۔ مکان نمبر ۱۱۰۰"

"اس ہوٹل کا نام جس میں وہ کھانا کھانے جاتے تھے؟"

"ہوٹل انشارجہ" انھوں نے کہا۔

"جی۔ کیا مطلب۔ ہوٹل انشارجہ" محمود حیران رہ گیا۔

"ہاں! انشارجہ کے لوگوں نے کھولا ہے۔ انھیں پچھوں کو انشارجہ کے ہی کھانے پسند ہیں، اس لیے یہاں بھی انھوں نے ایسی ہی جگہ تلاش کی تھی" وہ بولے۔

"اور کوئی بات۔ جو آپ بتانا چاہتے ہوں"

"معلومات تو بس یہی ہیں اور جو بات آپ معلوم کرنا چاہیں" وہ بولے۔

"اس دن وہ کس وقت کا کھانا کھانے گئے تھے؟"

"رات کا" انھوں نے جواب دیا۔

"اور وہ واپس نہیں لوٹے؟" محمود نے پوچھا۔

"جی ہاں! یہی بات ہے"

"آپ نے ہوٹل انشارجہ کو فون کیا؟"

"جی ہاں! فون کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ مسٹر خاور بگرامی کھانا کھانے آئے تھے، انھوں نے کھانا کھایا۔ اور پھر رخصت ہو گئے تھے"

"اس کا مطلب ہے۔ یا تو وہ ہوٹل میں ہی گم ہوئے۔ یا

واپسی پر راستے میں" فاروق منمنایا۔

"جی ہاں! اب آپ کا کیا خیال ہے"

"ہم ان کو تلاش کریں گے۔ اس معاملے میں سسپنس موجود ہے اور جب کسی معاملے میں سسپنس ہوتا ہے تو ہم اس پر کام ضرور کرتے ہیں۔ جوں ہی ہمیں مسٹر خاور بگرامی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا، ہم آپ کو اطلاع دے دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے گھر بھی آئیں۔ اس لیے آپ اپنا پتا بھی نوٹ کروا دیں"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ میں احسان نگر میں رہتا ہوں۔ کوٹھی کا نمبر ۵۰۶ ہے"

"شکریہ۔ آپ اس معاملے کو اب ہم پر چھوڑ دیں۔ یعنی بے فکر ہو کر گھر جائیں" فاروق مسکرایا۔

"خیر جناب! میں بے فکر ہو کر تو نہیں جا سکتا۔ جب تک میرے دوست نہ مل جائیں"

"اچھا خیر۔ فکر مند ہو کر چلے جائیے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں"

"شکریہ جناب! میں نے تو سوچا تھا۔ انسپکٹر صاحب کے سامنے سارے حالات بیان کروں گا، لیکن آپ لوگوں نے تو ان کے آنے سے پہلے ہی سب کچھ معلوم کر لیا" اس نے قدرے

حیران ہو کر کہا۔

"اسے ہماری کارگزاری سمجھیے۔ جو معاملات ہم کنٹرول کر سکتے ہیں۔ ان پر ہم خود ہی کام شروع کر دیتے ہیں۔ ابا جان کا انتظار نہیں کرتے۔ انھیں اس وقت تک آ جانا چاہیے تھا، لیکن وہ نہیں آئے۔ ضرور انھیں کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔ اس لیے اب ہم ان کا انتظار نہیں کریں گے۔ ہم اس وقت ہوٹل انشارجہ جا رہے ہیں۔ اسی لیے آپ کو مطمئن ہو کر گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔"

"میں شکر گزار ہوں، لیکن میرا خیال ہے۔ یہ کام معمولی نہیں ہے۔ اس لیے انسپکٹر صاحب کے آنے پر ان سے مشورہ کر کے ہی کوئی قدم اٹھائیے۔" انھوں نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"آپ کے نزدیک ہو گا یہ کام بہت غیر معمولی، لیکن ہمیں تو آئے دن ایسے کاموں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ البتہ آپ میری ایک الجھن رفع کر دیں۔"

"اور وہ الجھن کیا ہے؟" انھوں نے جلدی سے کہا۔

"یہ کہ آپ پورا ایک ماہ گزر جانے پر ہمارے پاس کیوں آئے۔ اس سے پہلے ضرورت کیوں محسوس نہیں کی؟"

"اسے میری کم عقلی کہہ لیں کہ میں پولیس سے امید لگائے رہا،

تنگ آ کر میں نے آپ لوگوں کے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔"

"کاش! آپ فوراً ہمارے پاس آ جاتے۔" محمود نے سرد آہ بھری۔

"کیوں۔ کیوں؟" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"اس وقت معاملہ بالکل تازہ تھا۔ ہم بہت جلد ان کا سراغ لگا لیتے۔ اب واقعے کو پورا ایک ماہ گزر گیا ہے۔ آثار، نشانات اور ثبوت اتنا عرصہ گزر جانے پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اب مثال کے طور پر ہم اسی روز معلومات حاصل کرنے جاتے جس روز وہ گھر نہیں پہنچے تھے۔ ہوٹل کی جس میز پر انھوں نے کھانا کھایا تھا۔ اس کے آس پاس کے میزوں پر کھانا کھانے والوں کا سراغ لگایا جا سکتا تھا، ان سے یہ بات معلوم کی جا سکتی تھی کہ انھوں نے واقعی کھانا کھایا تھا یا نہیں۔ وہ ہوٹل پہنچے تھے یا نہیں، یا انھیں ہوٹل سے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا یا نہیں۔"

"ہوں۔ یہ باتیں تو آپ کی بالکل ٹھیک ہیں۔ افسوس! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔"

"جی ہاں! بس یہی بات ہم آپ سے کہنا چاہتے تھے کہ آپ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔" فاروق مسکرایا۔

"اور یہ بات میں نے خود ہی تسلیم کر لی۔" انھوں نے بھی مسکرا کر کہا، پھر اٹھتے ہوئے بولے،

"اچھا تو میں اب چلتا ہوں۔"

انھوں نے دروازے تک جا کر انھیں رخصت کیا اور پھر صحن کی طرف مڑے، لیکن اسی وقت دروازے کی گھنٹی بج اٹھی، انھوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، کیوں کہ انداز انسپکٹر جمشید کا نہیں تھا، پھر محمود نے دروازہ کھول دیا۔

انھوں نے دیکھا، دروازے میں ایک اور ملاقاتی کھڑا تھا۔

❁

انسپکٹر جمشید نے جیپ روک لی۔ نیچے اترے اور گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی کے آخری مکان پر پہنچ کر انھوں نے دروازے پر لگا گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اندر دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ آخر قدموں کی چاپ سنائی دی اور دروازہ کھلا۔ سفید ڈاڑھی والا ایک بوڑھا نظر آیا۔ اس نے ایسے انداز میں ان کی طرف دیکھا جیسے نظر کمزور ہو:

"کون صاحب ہیں؟"

"انسپکٹر جمشید۔"

"اوہو۔ یہ آپ ہیں۔ تو پھر تشریف لائیے۔ رک کیوں گئے۔"

"ماسٹر اندر ہیں؟"

"جی ہاں! تشریف رکھتے ہیں۔"

"تب تو میں ضرور اندر آؤں گا۔"

"لیکن جناب۔ یہ تو بہت زیادتی کی بات ہے۔ اگر ماسٹر اندر نہ ہوں۔ تب بھی تو آپ آ سکتے ہیں۔ اس گھر کے دروازے تو ہر وقت آپ کے لیے کھلے ہیں۔ اور گھر کے افراد آپ کے پرانے خادم ہیں۔"

"ہاں! اس میں تو کوئی شک نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا، پھر اندر داخل ہوئے۔ بوڑھا ادب سے ایک طرف ہٹ گیا اور پھر ان کے پیچھے چلنے لگا۔

مکان بہت پرانا تھا اور تعمیر بھی بہت پرانے طرز کی تھی، صفائی وغیرہ کی طرف بھی خیال نہیں کیا گیا تھا۔ اس طرح اور بھی پرانا لگ رہا تھا۔ طویل برآمدہ طے کرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ اور قالین پر تین آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سگریٹ تھے۔ قدموں کی آہٹ سن کر بھی انھوں نے دروازے کی طرف نہ دیکھا۔ البتہ ان میں سے ایک نے کہا:

"کون تھا جمو بابا؟"

"کون تھا نہیں ماسٹر۔ کون تھے۔"

"ارے!" اس نے پتے پھینک دیے اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے ساتھیوں نے بھی یہی کیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے دروازے
کی طرف مڑے اور ایک ساتھ بولے:
"خوش آمدید۔ انسپکٹر صاحب"
انسپکٹر جمشید مسکرا کر رہ گئے:
"گویا تھے کا لفظ یہاں صرف اور صرف میرے لیے رہ
گیا ہے" وہ بولے۔
"جی ہاں! ہم اپنے محسن کے لیے ادب کے الفاظ استعمال کرتے
ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے۔ کہیے تکلیف کی آپ نے؟"
"ایک ضروری مسئلہ ہے۔ میں تنہائی میں بات کرنا پسند کروں
گا" وہ بولے۔
"آپ جانتے ہی ہیں۔ یہ میرے با اعتماد ساتھی ہیں"
"اس کے باوجود میں بالکل الگ رہ کر بات کرنا چاہوں گا۔
معاملہ بہت ہی نازک ہے۔ امید ہے۔ تمہارے تینوں ساتھی برا
نہیں مانیں گے"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔ آپ کی بات کا برا اور
ہم مانیں گے۔ وہ دن ہماری زندگی کا آخری دن ہوگا" وہ مسکرائے۔
"شکریہ تانے۔ اب تم تینوں۔ دوسرے بلکہ تیسرے کمرے میں
چلے جاؤ۔ یہ میں تمہارے ہی فائدے کے لیے کر رہا ہوں"
"بہت بہتر" تانے نے کہا۔

بھو، تانے اور تیسرا ساتھی کمرے سے نکل گئے۔ اب وہاں ہیڈ
ماسٹر اور انسپکٹر جمشید رہ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے کمرے کا دروازہ اندر
سے بند کر لیا:
"ماسٹر۔ یہ تینوں ہماری گفتگو سننے کی کوشش تو نہیں کریں گے"
"ان کی اتنی جرأت نہیں کہ جس معاملے کو آپ نے خفیہ کر دیا،
اس کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کریں"
"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ اور اس
کے بارے میں تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں"
"اگر مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا تو ضرور بتاؤں گا"
اس نے کہا۔
وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ گندا لباس پہنے ہوئے تھا۔
اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں، جن میں بلا کی چمک تھی۔
انسپکٹر جمشید نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکال کر تپائی
پر رکھ دی۔
ماسٹر بوکھلا کر اٹھا اور چھلانگ لگا کر کئی میٹر دور جا گرا۔
"ارے ارے۔ بھئی۔ یہ کیا؟"
"آپ۔ آپ کو ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا میرے محسن"
اس نے قدرے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔
"لیکن بھئی۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

"اور آپ کر رہے ہیں۔ آپ نے کیا کیا ہے:" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! میں نے یہ چیز ہی تو تمہارے سامنے رکھی ہے۔"

"تب پھر۔ شاید آپ اس چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"اگر جانتا تو یہاں کیوں آتا ماسٹر!"

"تب پھر۔ مجھے معاف کر دیں۔ میرا لہجہ ناخوش گوار ہو گیا تھا۔"

"پروا نہ کرو۔ تمہارے لہجے میں ناخوش گواری آنا قدرتی بات ہے۔" وہ مسکرائے۔

"یہ۔ ایک خاص علاقے کا ہتھیار ہے۔ حد درجے خوف ناک ہتھیار۔ آپ بھی اس سے بال بال بچ گئے۔ اگر اتفاق سے اس پر لگی ہوئی پن آپ دبا دیتے تو شاید اس وقت تک میں پانی بن چکا ہوتا۔ اور جس وقت یہ آپ کو ملا تھا۔ اگر آپ اس کا رُخ اپنی طرف کر کے یہ پن دبا دیتے تو آپ پانی بن گئے تھے۔" ماسٹر نے کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو ماسٹر؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں نے کہا ہے۔ یہ ایک علاقے کا انتہائی خطرناک ہتھیار

ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں ابھی تجربہ کرا دوں۔"

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔"

"کیا آپ کو اپنے نشانے میں پوری طرح مہارت حاصل ہے؟"

"اللہ کی مہربانی ہے۔"

"تب پھر پستول نکال لیجیے۔ اور تیار ہو جائیے۔ آپ کو بائس کے اس بند ٹکڑے میں ایک باریک سا سوراخ نظر آ رہا ہے۔ آ رہا ہے نا؟" وہ بولا۔

"ہاں! نظر آ رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید پُرسکون آواز میں بولے۔

"پن کے دبتے ہی یہ سوراخ بڑا ہو جائے گا۔ اور اس میں سے دُنیا کا مختصر ترین، تیز ترین اور زہریلا ترین سانپ نکلے گا۔ نکلتے ہی وہ گولی سے بھی زیادہ تیزی سے آپ کی پیشانی سے ٹکرائے گا۔ آپ دھڑام سے گریں گے اور پانی میں تبدیل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ آپ کے پورے جسم کو پانی میں تبدیل ہونے میں صرف تین منٹ لگیں گے۔ مگر آپ گرنے سے پہلے جائیں گے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"کیا خیال ہے۔ تجربہ کرنا ہے؟"

"ٹھہرو بھئی۔ پہلے ہم غور کر لیں۔ اگر میں سامنے کے رُخ نہ ٹھہروں۔ تو سانپ کیا کرے گا؟"

"اس صورت میں وہ میری طرف آئے گا۔ لیکن اس طرح ایک

ملنے کی دیر ہو جائے گی اور ماہر آدمی ایک ملنے سے فائدہ اٹھا کر اسے ہتھیار بنا سکتا ہے۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ اس میں سانپ موجود ہی ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کا سانپ پہلے ہی پتی دبا کر نکال دیا گیا ہو" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہی تو آپ سمجھے نہیں۔ میری ساری زندگی سانپوں میں گزر گئی ہے۔ ملکوں ملکوں پھرا ہوں، لیکن اگر کسی سانپ سے خوف محسوس ہوا ہے تو اس سے۔ اپنے شکار کو ڈسنے کے بعد یہ پھر بانس کے اسی بند ٹکڑے میں گھس جاتا ہے۔ گھسنے کے لیے اسے یہ باریک سا سوراخ ہی کافی ہے۔"

"اور یہ کھاتا پیتا کیا ہے؟"

"بانس کے ٹکڑے سے ہی اپنی خوراک حاصل کر لیتا ہے۔ مہینوں کھائے پیے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ بس ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہوا اس سوراخ سے کھینچ لیتا ہے۔"

"لیکن اسے سوراخ میں بند کس طرح کیا جاتا ہے؟"

"اوہ۔ آپ نہیں سمجھے۔ یہ بانسوں کے جنگل میں ہی پیدا ہوتا ہے۔ بانس کا گودا اس کی خوراک ہے۔ اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے یہ بانسوں کے جوڑوں کے درمیان گھس جاتا ہے۔ لیکن یہ ہتھیار بنانے والوں نے اپنا طریقہ ایجاد کر لیا ہے۔ ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جنگل

میں ڈال دیتے ہیں اور جب سانپ ان میں داخل ہو جاتے ہیں تو سوراخ کو تنگ کر دیتے ہیں۔"

"انہیں کس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سانپ فلاں ٹکڑے میں داخل ہو گیا ہے اور فلاں میں نہیں؟"

"کان لگا کر اس کی پھنکار سن لیتے ہیں۔"

"ہوں، لیکن ابھی ابھی تم نے بتایا ہے کہ جب ہم پتی دبائیں گے تو سوراخ بڑا ہو جائے گا اور سانپ اندر سے نکل آئے گا، سوال یہ ہے کہ وہ پھر کس طرح اندر گھس جاتا ہے؟"

"تنگ سوراخ میں اس کے لیے گھسنا آسان ہے، مشکل نہیں، دوسرے یہ کہ پتی کا تعلق اندر ایک چٹخنی سے ہے۔ وہ چٹخنی جہاں سوراخ کو بڑا کرتی ہے، وہاں اس کی دم کو بھی دباتی ہے اور یہ گھبرا کر باہر نکلتا ہے۔"

"ہوں۔ میں سمجھ گیا۔ پھر بھی یہ کام ہے بہت مشکل۔ میں حیران ہوں کہ وہ لوگ یہ ہتھیار بنانے کے لیے اتنی مصیبت کیوں مول لیتے ہیں؟"

"کتنی مصیبت۔ انہیں تو سرے سے کوئی مصیبت نہیں مول لینا پڑتی۔ بانس کے ٹکڑے تیار کرنا پڑتے ہیں۔ ان کے اندر پتیاں فٹ کرنا پڑتی ہیں۔"

"اور یہ کام وہ کس طرح کرتے ہیں؟"

ٹکڑوں کو درمیان سے کھول کر۔ ان کے پاس ایک درخت کا گوند ہوتا ہے، وہ اس گوند سے دونوں ٹکڑوں کو چپکا دیتے ہیں اور بانس کا ٹکڑا گویا اپنی اصل حالت پر آ جاتا ہے، پھر اس جگہ سے نہیں ٹوٹتا۔"

"اور یہ ہتھیار کس ملک کے لوگوں کا ہے؟"

"افریقہ کے گھنے جنگلوں میں رہنے والے لوگوں کا۔ وہیں یہ بانس پیدا ہوتا ہے اور یہ سانپ بھی۔"

"لیکن وہ اس ہتھیار سے کیا کام لیتے ہیں؟"

"قافلے لوٹتے ہیں۔ شکاریوں کے قافلے، تجارتی قافلے۔ وہاں کچھ ایسی گزرگاہیں ہیں جہاں صرف پیدل راستا طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ ان راستوں پر گھات لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اپنے اس خاموش ہتھیار سے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔"

"بہت قیمتی معلومات حاصل ہو گئیں۔ تمھارا بہت بہت شکریہ ماسٹر!" انسپکٹر جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے۔ آپ تو اس سانپ کے نکلنے کا تجربہ کرنے والے تھے!" ماسٹر نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں! میں اس ہتھیار کو محفوظ رکھوں گا۔" وہ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔

"ایک منٹ۔ ایک سوال کا آپ کو بھی جواب دینا ہوگا۔"

"اور وہ سوال یہ ہے کہ مجھے یہ ہتھیار کہاں سے ملا۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں! یہی بات ہے۔" ماسٹر نے جھینپ کر کہا۔

"ایک شخص گھات لگائے بیٹھا تھا۔ بس مجھے میری چھٹی حس نے خطرے سے آگاہ کر دیا اور میں اس کے وار سے بچ گیا۔ پھر میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے جان توڑ کر مقابلہ کیا، لیکن میرے مکوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس کے بے ہوش ہونے پر جب میں نے اس کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے کوئی ہتھیار نہ نکلا۔ میں نے خیال کیا کہ اس کا ہتھیار وہیں کہیں گر گیا ہوگا، جب میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو مجھے یہ چیز پڑی نظر آئی، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بعد میں سانپ کی پھنکار کا بھی احساس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تمھارا خیال آیا۔ میں نے سوچا، سانپوں کے بارے میں تم سے بہتر کون جانتا ہوگا، لہٰذا یہاں چلا آیا۔"

"اور اس آدمی کا کیا بنا؟"

"وہ حوالات میں ہے۔ اس نے اپنا منہ بالکل بند کر لیا ہے، کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا۔"

"اور نہ ہی دے گا۔ یہ لوگ جان تو دے سکتے ہیں، لیکن

زبان نہیں کھول سکتے۔ اگر آپ مجھے وہ جگہ بھی بتا دیں۔ جہاں وہ شخص گھات لگائے بیٹھا تھا تو شاید میں کچھ اور کام آ سکوں۔"

"ہوں! میرا خیال ہے۔ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ شخص شہر کی جنوبی سڑک پر پہاڑیوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ میں صبح سویرے روزانہ اس طرف سیر کے لیے جاتا ہوں۔"

"تب ان پہاڑیوں میں اس کے کچھ اور ساتھی بھی چھپے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ایک جگہ پر کم از کم تین ضرور ہوتے ہیں۔ اب وہ دو اپنے ساتھی کو چھڑانے کی فکر میں ہوں گے۔ اور اگر وہ حوالات تک پہنچ گئے تو یقیناً اسے چھڑا لیں گے۔"

"نن۔ نہیں۔" انسپکٹر جمشید ہکلائے۔

"میرا خیال ہے۔ آپ نے یہ بات بتانے میں دیر کر دی۔ وہ اس وقت تک اپنے ساتھی کو لے بھی گئے ہوں گے۔"

"ارے نہیں بھئی!" ان کے لہجے میں بے اعتباری تھی۔

"خیر۔ آپ فون کر لیں۔"

"قالین پر فون موجود تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی اس تھانے کے نمبر ڈائل کیے جس کی حوالات میں مجرم کو بند کروایا تھا۔ کافی دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ لیکن کسی نے فون کا ریسیور نہ اٹھایا۔

"کیوں جناب۔ کیا ہوا؟"

"کوئی فون کا ریسیور نہیں اٹھا رہا۔ اور یہ ایک بات عجیب

بات ہے، کیوں کہ تھانے میں تو چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی موجود ہوتا ہے۔"

"آپ سے اس آدمی کی ملاقات صبح ہوئی تھی نا؟" ماسٹر نے پوچھا۔

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"اور صبح ہی آپ نے اسے حوالات میں بند کروا دیا تھا؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"تب پھر وہ موقعے کی تاک میں رہے ہوں گے۔ کچھ وقت انھیں تھانے کا پتا چلانے میں بھی لگا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے تھانے میں آدمی کم رہ جانے کا انتظار کیا ہوگا اور جب عملہ کسی طرف نکل گیا ہوگا تو اس وقت انھوں نے اپنی کارروائی شروع کی ہوگی۔ اب میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے ساتھی کو لے جا چکے ہیں اور تھانے میں رہ جانے والا عملہ اس وقت تک موت کی نیند سو چکا ہے۔ بلکہ پانی میں تبدیل ہو چکا ہوگا۔" ماسٹر نے کانپتی آواز میں کہا۔

"نہیں!" انسپکٹر جمشید چلائے۔

ساتھ ہی انھوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک منٹ بعد وہ جیپ میں بیٹھے اسی تھانے کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ان کا رنگ اڑ گیا تھا۔ آندھی اور طوفان کی طرح جیپ چلاتے آخر وہ تھانے تک پہنچ گئے اور جیپ کو اندر لے گئے۔

تھانے میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ حوالات کا دروازہ کھلا تھا۔ اور اس میں ایک قیدی بھی نہیں تھا۔ دروازے پر بھی کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ نہ دفتر میں محرر بیٹھا تھا۔ البتہ دروازے پر اور دفتر میں کپڑوں کے دو ڈھیر ضرور پڑے تھے۔ ان ڈھیروں کے آس پاس پانی پھیلا ہوا تھا اور اس میں سے عجیب سی بُو اٹھ رہی تھی۔

انسپکٹر جمشید تھرا اٹھے۔

ملاقاتیوں کا دِن

"فرمائیے۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ کیا آپ کا بھی کوئی مہمان گم ہو گیا ہے؟" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ زور سے چونکا۔

"اس میں اس قدر چونکنے کی تو کوئی بات نہیں۔" محمود بولا۔

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے یہ کیوں کہا کہ کیا میرا بھی کوئی مہمان گم ہو گیا ہے؟"

"اس کی وجہ یہ ہے۔ ابھی ابھی ایک صاحب ہم سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ان کا مہمان گم ہو گیا ہے۔"

"اوہ!" وہ بڑبڑائے۔

"اب آپ بتائیے۔ آپ مہمان کے نام پر کیوں چونکے؟"

"میرا خیال ہے۔ حالات کچھ زیادہ ہی عجیب ہیں۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"کس کے حالات۔ آپ کے یا ہمارے؟"

"شاید ہم سب کے۔" اس نے کہا۔

"مہربانی فرما کر وضاحت کریں۔ ہم ابھی نہیں سمجھ سکے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"انسپکٹر صاحب اندر ہیں؟" اس نے جیسے فرزانہ کا جملہ سنا ہی نہیں۔

"نہیں! ابھی نہیں لوٹے۔ اگر آپ حالات صرف ان سے کہنا چاہتے ہیں تو آپ کو انتظار کرنا پڑے گا، کب تک کرنا پڑے گا، اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے، ابا جان چند منٹ میں آ جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح تک نہ آئیں۔"

"تب پھر میں حالات آپ لوگوں کو ہی سنا دیتا ہوں۔"

"اور کیا دروازے پر کھڑے رہ کر سنائیں گے؟" فاروق نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ آپ کی مرضی کی بات ہے۔ میں آپ کے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اگر آپ مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"ہوں! آپ بھی پہنچے ہیں۔ آئیے اندر چل کر بیٹھیں۔ اور ہم آپ سے یہ بھی امید کریں گے کہ آپ ہمیں معاف فرما دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، معاف کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔" اس نے

پہلی بار مسکرا کر کہا۔

وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

"میرا خیال ہے۔ آپ نے ابھی تک ہمیں اپنا نام نہیں بتایا۔"

"اوہ ہاں! میرا نام باقر رضا ہے۔"

"مہربانی فرما کر پورا تعارف کرائیں۔"

"میں ایک تاجر ہوں۔ کپڑے کا تاجر۔ بہترین قسم کا کپڑا اپنے ملک میں تیار کرتا ہوں اور دوسرے ملکوں میں بھیجتا ہوں۔ عام طور پر ہمارے ملک کے مال کی مانگ دوسرے ملکوں میں نہ ہونے کے برابر ہے، کیوں کہ تاجر حضرات ایمان داری سے کام نہیں لیتے، نمونہ کچھ بھیجتے ہیں، مال کچھ۔ یا کچھ عرصے تک تو مال اچھا بھیجتے رہتے ہیں، پھر ناقص مال سپلائی کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس طرح آہستہ آہستہ ہمارے ملک کی منڈیاں بدنام ہو گئی ہیں۔ اور غیر ممالک میں ہمارا مال اٹھانا کوئی پسند نہیں کرتا، لیکن میری مل کا کپڑا بہت مشہور ہے۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی مانگ خوب ہے۔ اس لیے کہ میں مال کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر میں رہتا ہوں۔ گھٹیا بنانے کی کوشش ہرگز نہیں کرتا۔ کیا اتنا تعارف کافی رہے گا؟"

"جی نہیں۔ یہ تو بالکل ناکافی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"جی۔ کیا فرمایا۔ بالکل ناکافی۔ تو پھر کافی تعارف کسے کہتے

ہیں۔"

"آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا۔ آپ کہاں رہتے ہیں، آپ کی مل کہاں ہے؟"

"میں ۱۱۰، ارجن روڈ پر رہتا ہوں۔ مل شہر سے باہر جنوبی سڑک پر ہے۔ اس کا نام رضا ٹیکسٹائل مل ہے۔ اب کیا خیال ہے۔ تعارف مکمل ہو گیا یا نہیں؟"

"جی نہیں۔ ابھی تک نہیں۔" محمود نے فوراً کہا۔

"کیا کہا۔ ابھی بھی مکمل نہیں ہوا، یہ آپ نے کیا کہا۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بالکل ٹھیک کہا۔ آپ نے بتایا ہے کہ آپ کی مل جنوبی سڑک پر ہے، لیکن اس طرف تو پہاڑی علاقہ ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ کیا پہاڑی علاقے میں مل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ جنوبی سڑک پر ایک طرف تو پہاڑیاں ہیں، دوسری طرف میدانی علاقہ ہے۔ میدانی علاقے میں میری مل ہے۔"

"چلیے خیر۔ مان لیتے ہیں۔ اور یہ بھی مان لیتے ہیں کہ اب آپ اپنا تعارف مکمل کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آگے چلیے۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے کی؟" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"بات صرف یہ ہے کہ میرا واقعی ایک مہمان گم ہو گیا ہے۔"

"کیا!!" تینوں ایک ساتھ چلّائے۔ ان کی آنکھیں حیرت اور [illegible]ت سے پھیل گئیں۔

باقر رضا نے حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا، پھر جلدی سے بولا:

"اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا شہر بھر میں دو آدمیوں کے مہمان گم نہیں ہو سکتے؟"

"ہو سکتے ہیں جناب۔ دو کیا سو آدمیوں کے مہمان گم ہو سکتے ہیں اور ہمیں اس گم شدگی پر حیران ہونے کا بھی کوئی حق نہیں۔ ہم تو حیران صرف اس بات پر ہو رہے ہیں کہ ایسے لوگ آج ہمارے پاس کیوں آ رہے ہیں۔"

"جب کسی کو کوئی راستہ نہ سوجھے تو کیا کرے۔" اس نے کندھے اُچکائے۔

"کیا کرے گا، یہ مطلب نہیں کہ بس ہماری طرف آ جائے۔"

"خیال سوجھنے کی بات ہے۔ مجھے آپ کا خیال سوجھ گیا اور میں آ گیا۔"

"اور اسی طرح مسٹر رومی جنگ صاحب کو ہمارا خیال سوجھ گیا۔ وہ بھی ہمارے پاس آ گئے۔"

"کیا!" اس بار یہ کیا باقر رضا کے منہ سے نکلا تھا۔

"اب آپ کو اس قدر زور سے اُچھلنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس لیے کہ مسٹر رومی جنگ اور میں گہرے دوست ہیں۔"

"اوہ! تب تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کا مہمان خاور بلگرامی گم ہو گیا ہے۔"

"ہاں! یہی تو مجھے پریشانی ہے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ پہلے رومی کا مہمان گم ہوا اور اب میرا۔"

"آپ کا مہمان کب گم ہوا؟"

"پندرہ دن پہلے۔" اس نے کہا۔

"اور آپ کے مہمان کا نام کیا ہے؟" فاروق بولا۔

"جہان شاہ۔ وہ مجھاسا سے آیا تھا۔"

"یہ مجھاسا کیا بلا ہے؟"

"ایک افریقی ریاست۔ کسی زمانے میں اس کے ماں باپ وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد اس نے بھی وہیں رہائش اختیار کیے رکھی۔"

"لیکن اس کا آپ سے کیا تعلق؟"

"اس کے ماں باپ میرے ماں باپ کے دوست تھے۔ اس وقت سے خط وکتابت چلی آ رہی ہے۔"

"اور مسٹر جہان شاہ یہاں کس لیے آئے تھے؟"

"اس ملک کو دیکھنے۔ اس نے جب سے آنکھ کھولی۔ اس ملک کو نہیں دیکھا۔ آخر اس کے ماں باپ یہاں پیدا ہوئے

تھے۔"

"ہوں! اور وہ غائب ہو گئے۔"

"ہاں! پندرہ دن پہلے وہ گھر سے کھانا کھانے نکلے۔ اور لوٹ کر نہیں آئے۔"

"تو وہ بھی کھانا گھر میں نہیں کھاتے تھے۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"آپ نے جملے میں بھی کیوں لگایا؟" اس نے چونک کر کہا۔

"اس لیے کہ مسٹر رومی جنگ کا مہمان خاور بلگرامی بھی ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ اور کھانا کھانے گیا تھا، واپس نہیں لوٹا۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"اب آپ مہربانی فرما کر یہ بتائیے کہ وہ کون سے ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے؟"

"ہوٹل انشارجہ میں۔" باقر رضا نے کہا۔

"کیا!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"آپ۔ آپ اتنے زور سے کیوں بولے؟" باقر رضا نے بوکھلا کر کہا۔

"اس لیے کہ مسٹر خاور بلگرامی بھی ہوٹل انشارجہ میں کھانا کھاتا تھا۔"

"نہیں!" باقر رضا کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"واقعی! یہ ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ آپ اور رومی جنگ

دونوں دوست ہیں، آپ دونوں کے ہاں دُوسرے مُلکوں سے دو مہمان آئے، دونوں مہمان انشارجہ ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے تھے۔ دونوں ہی غائب ہو گئے۔ آپ دونوں نے پولیس میں رپورٹیں درج کرائیں، لیکن پولیس دونوں مہمانوں کا کوئی سُراغ نہیں لگا سکی۔ آپ دونوں ہمارے پاس آئے۔ یہ بھی اتفاقات عجیب ہیں، خیر ہم اس کیس پر کام شروع کرتے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔ کوئی اور بات اگر بتانا پسند کریں تو بتا دیں۔"

"اور کیا بات بتاؤں۔ گم شدہ مہمان کی وجہ سے پریشان ہوں۔ مہاسا ہیں اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں، کئی بار فون کر چکے ہیں، میں انھیں تسلیاں دے دے کر تھک گیا ہوں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ میں کیا کروں؟"

"صبر!" فاروق نے کہا۔

"جی۔ جی ہاں۔ صبر تو کر ہی رہا ہوں۔"

"بس تو پھر صبر کرتے ہوئے کسی اور چیز کے کرنے کی ضرورت نہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"آپ۔ آپ عجیب ہیں۔"

"ہاں! مجھے یہ بات تسلیم ہے۔" اس نے کہا۔

"آپ تشریف لے چلیے جناب۔ اگر دونوں مہمان زندہ ہیں تو ان شاء اللہ ہم انھیں تلاش کر کے رہیں گے۔ زندہ نہیں ہیں تو اور

بات ہے۔" محمود نے فاروق کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اس صورت میں بھی ہم ان کی لاشیں تو تلاش کر ہی لیں گے۔" فاروق بولا۔

"تم پھر بولے۔" محمود جھلا اُٹھا۔

"اچھا! میں چلتا ہوں۔ میرا پتا تو آپ کو یاد رہے گا۔ ۔۔۔ ۱۱، اور جی روڈ۔"

"جی ہاں۔ فون نمبر بھی لکھوا دیں۔"

اس نے فون نمبر لکھوایا اور چلا گیا۔

"چلو بھئی۔ ہوٹل انشارجہ ہو آئیں۔" محمود بولا۔

"لیکن ابھی ابّا جان نہیں آئے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"تو کیا ہوا۔ انھیں کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔ ٹھہرو۔ پہلے ان کے دفتر فون کر کے معلوم کر لوں۔" محمود نے کہا اور فون پر نمبر ملانے لگا، پھر سلسلہ ملنے پر بولا:

"ہیلو۔ انکل۔ ابّا جان ابھی دفتر میں ہی ہیں؟"

"نہیں تو۔ وہ تو ٹھیک وقت پر یہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔"

"اور کیا گھر کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ یا کہیں اور جانا تھا؟" محمود نے فکر مندانہ انداز میں کہا۔

"یہاں سے کچھ کہہ کر نہیں گئے۔ جس کا مطلب یہی ہے

کر گھر کے لیے ہی روانہ ہوئے تھے۔"

"اچھا شکریہ!" محمود نے کہا اور ریسیور رکھتے ہی لگا تھا کہ ا

نے پوچھا:

"تو انسپکٹر صاحب ابھی گھر نہیں پہنچے؟"

"اگر گھر پہنچ گئے ہوتے تو میں آپ سے کیوں پوچھتا انکل!"

"لیکن یہ کوئی فکر والی بات نہیں۔ انھیں کوئی کام پڑ گیا

ہو گا۔"

"جی ہاں، یہی تو بات ہے۔ ہم نے تو ان کے گھر نہ پہنچنے کی

وجہ سے فون کیا ہے۔"

"اچھا!" اکرام نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"ابا جان بھی کہیں مصروف ہیں، وہ نہ جانے کب لوٹیں

مہمان کا معاملہ پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہے، بلکہ پرانا ہو چکا

ہے۔ اب اور پرانا نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا۔ آؤ چلیں۔"

آخر فاروق اور فرزانہ کو بھی اٹھنا پڑا۔ تینوں باورچی خا

کے دروازے پر آئے ہی تھے کہ ان کی امی بول اٹھیں:

"میں ساری بات سن چکی ہوں۔ تم تینوں ہوٹل ...

جا رہے ہو۔ ٹھیک ہے، میں دروازے بند کیے لیتی ہوں۔"

کہتے ہوئے وہ باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

ابھی چاروں دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ گھنٹی ایک بار

بج اٹھی۔ انھوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

کیوں کہ انداز انسپکٹر جمشید کا نہیں تھا:

"تت۔ تیسرا ملاقاتی۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"کہیں اس کا بھی مہمان گم تو نہیں ہو گیا۔" فرزانہ بولی۔

"شاید آج کا دن ملاقاتیوں کا دن ہے۔" محمود بڑبڑایا اور

دروازہ کھولنے کے لیے قدم بڑھایا۔

"ایک منٹ۔ پہلے میں باورچی خانے میں چلی جاؤں۔" بیگم

جمشید جلدی سے بولیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئیں۔ ساتھ

ہی محمود نے دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے دیکھا۔ دروازے میں

لمبے چوڑے جسم کا مالک ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر

بڑی بڑی مونچھیں تھیں:

"فرمائیے۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"رومی جنگ اور باقر رضا یہاں کس لیے آئے تھے؟" اس نے سرد

آواز میں کہا۔

"آپ کون ہیں اور ہم سے یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"تم مجھے نہیں جانتے، لیکن میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔

لو میں اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے محمود کی ٹھوڑی پر ایک مکا

جڑ دیا۔

باس آرہا ہے

"اُف اللہ۔ یہ۔ یہ تو واقعی پانی بن چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے، پھر انھوں نے فون اٹھا کر اکرام کو اطلاع دی۔ جلد ہی وہاں ماہرین پہنچ گئے۔

"اکرام۔ ماہرین اپنا کام کرتے رہیں گے۔ آؤ ہم جنوبی سڑک کی طرف ہو آئیں۔ یہ خونی کھیل وہاں سے شروع ہوا ہے۔"

"خونی کھیل۔ وہاں سے شروع ہوا ہے۔ میں سمجھا نہیں۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

اب انھوں نے ساری کہانی اسے بھی سنائی۔ اکرام کی حیرت کا کیا پوچھنا۔

"اور وہ ہتھیار آپ کے پاس بھی موجود ہے۔"

"ہاں، لیکن میں نے اسے استعمال نہیں کیا۔" وہ مسکرائے۔

دونوں جیپ میں بیٹھ کر جنوبی سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔

"ابھی ابھی محمود نے فون کیا تھا۔"

"وہ میرے وقت پر گھر نہ پہنچنے کی وجہ سے پریشان ہوں گے، خیر کوئی بات نہیں۔ ہم جنوبی سڑک کی سیر کے بعد گھر ہی چلیں گے۔"

"آپ کے خیال میں، وہ شخص آپ پر کیوں حملہ کرنا چاہتا تھا؟"

"مجھ سے یہی غلطی ہو گئی۔ کہ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکا۔ دراصل مجھ سے جھڑپ کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ہسپتال پہنچا دیا اور متعلقہ تھانے کو فون کر دیا کہ جب وہ بہتر حالت میں آ جائے تو اسے حوالات میں بند کر دیں۔ میں اس سے کسی وقت ملاقات کر لوں گا۔ دوسری صبح میں دفتر آ گیا، دفتر سے اٹھ کر اپنے ایک دوست ماسٹر سے ملنے چلا گیا۔ ماسٹر سے اس بانس کے ٹکڑے کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ ساری تفصیل اس سے سنتے ہی میں تھانے کی طرف دوڑا، لیکن دیر ہو چکی تھی۔"

"گویا ان لوگوں کا ٹھکانا جنوبی سڑک پر ہی کہیں ہے۔" اکرام بڑبڑایا۔

"لیکن سر۔ سوال تو یہ ہے کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں بھی یہی معلوم کرنے کے لیے بے چین ہوں اکرام۔" وہ مسکرائے۔

جنوبی سڑک پر ایک جگہ انھوں نے جیپ روک لی۔

"یہی وہ جگہ ہے اکرام۔ جہاں اُس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔"

"اور آپ صبح کی سیر کرنے اس طرف آئے تھے۔" اکرام کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ؟"

"اتنی دُور آپ پیدل آتے ہیں؟"

"سیر تو پیدل ہی ہوتی ہے۔"

"اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ پر حملہ سوچ سمجھ کر کیا گیا۔"

"یہ بات بھی ہو سکتی ہے۔ اور ایک دُوسری بات بھی دُوسری یہ کہ وُہ مجھے لوٹنا چاہتا تھا۔ شاید ان لوگوں کا کوئی گروہ لوٹ مار کرنے کے لیے ان پہاڑیوں پر چھپ گیا ہے۔ اور موقع محل دیکھ کر حملہ کر دیتا ہے۔"

"ہوں، لیکن یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی۔ اتنے فن کار لوگ۔ جن کے پاس ہتھیار بھی دُنیا کا عجیب ترین ہو۔ وُہ صرف لوٹ مار کرنے کی غرض سے اپنے مُلک سے ہمارے مُلک میں آئے ہوں۔ نہیں سر۔ یہ ضرور کوئی اور بات ہے۔"

"ہاں اکرام۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ آؤ پہاڑیوں کا جائزہ لیں۔ لیکن ہر دم ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ موت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ادھر"

انھوں نے بانس کے ٹکڑے پر لگی پن دبائی۔ اُدھر اس میں سے انسان کو پانی بنا دینا والا سانپ نکلا۔"

"آپ تو مجھے ڈرائے دے رہے ہیں سر۔"

"بھئی۔ اگر یہ میدانی علاقہ ہوتا تو بات اور تھی۔ ان پہاڑیوں میں کیا معلوم کون کہاں چھپا بیٹھا ہے۔"

"تب پھر۔ آگے بڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔" اکرام نے گھبرا کر کہا۔

"آگے نہیں بڑھیں گے تو ان لوگوں سے ملاقات کس طرح ہو گی۔" وُہ بولے۔

"ہوں ! یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ گویا خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں۔" اکرام نے کندھے اچکائے۔

عین اسی وقت انسپکٹر جمشید ٹھٹک کر رُک گئے۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"خیر تو ہے سر۔"

"اکرام ! ہمیں گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔"

"جی گھیرے میں لیا جا چکا ہے، لیکن یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔" اکرام نے چاروں طرف دیکھا۔

"ہم انھیں نہیں دیکھ رہے۔ لیکن وُہ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔" وُہ بڑبڑائے۔ ساتھ ہی انھوں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ اکرام

قدم اٹھانا موت کو دعوت دینا ہوگا۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔" اکرام نے کہا۔

دونوں آگے قدم بڑھاتے رہے۔ اور اس طرح اونچائی پر پہنچ گئے:

"یہاں سے دائیں ہاتھ مڑ جاؤ دوستو۔" قدرے نرم لہجے میں کہا گیا۔

وہ دائیں ہاتھ مڑ گئے۔ انہیں پندرہ منٹ تک اور چلنا پڑا۔ ابھی تک وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔ گویا ان کے دشمن پہاڑیوں کی اوٹ لے لے کر آگے بڑھ رہے تھے اور اس صورت میں بھی وہ انہیں گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ پندرہ منٹ بعد انہیں ایک دراڑ نظر آئی۔ دراڑ بہت تنگ تھی۔ اور آگے راستہ بند تھا:

"اس دراڑ میں اتر جاؤ۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"آؤ بھئی۔ دیکھا جائے گا۔"

دونوں باری باری دراڑ میں اتر گئے۔ ساتھ ہی ان کے سروں پر کوئی بڑی اور بھاری چیز زور سے ماری گئی۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، پھر وہ تیورا کر گرے اور بے ہوش

نے بھی پستول نکالنے میں دیر نہیں لگائی:

"تم دونوں کے پستول ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تم پوری طرح ہماری زد پر ہو۔" پہاڑیوں میں ایک آواز گونجی۔ آواز زیادہ دور کی نہیں تھی۔

"اچھا تو پھر؟" انسپکٹر جمشید نے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔

"پستول پھینک دو۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ ہم تمہیں یہاں سے اپنے ٹھکانے تک لے چلیں گے۔ وہاں تم سے دو دو باتیں کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ ہم پستول پھینک رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جب پھینک دو گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔"

انسپکٹر جمشید نے پستول پھینک دیا۔ اکرام نے بھی یہی کیا۔

"اب آگے بڑھنا شروع کر دو۔"

"اچھی بات ہے۔" انہوں نے کہا اور آگے بڑھنے لگے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خود کو ان کے ہاتھوں میں دے رہے ہیں۔" اکرام نے سرگوشی کی۔

"اکرام۔ ہم نہیں جانتے۔ وہ پہاڑیوں میں کہاں کہاں موجود ہیں، ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ پہلے ہم ان سب کو دیکھ لیں۔ تب ہی کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس سے پہلے

ہو گئے۔ بے ہوش ہوتے ہوئے اُنھوں نے کسی کو کہتے سُنا:

"یہ مرحلہ تو طے ہوا۔"

ہوش آیا تو ان کے چاروں طرف افریقی نسل کے آدمی نظر آئے۔ ان میں سے ایک لمبے قد کا تھا۔ اور اس کے جسم پر ایک سیاہ لبادہ تھا۔ جس میں ستارے ٹانکے گئے تھے۔ سفید ستارے سیاہ کپڑے پر خوب چمک رہے تھے:

"ہمیں امید نہیں تھی انسپکٹر جمشید۔ تم اتنی آسانی سے ہمارے جال میں آ جاؤ گے۔"

"تو یہ تمھارا جال تھا۔" انسپکٹر جمشید نے مُنہ بنایا۔

"ہاں! کل تم سے جو آدمی ٹکرایا۔ وہ تو ایک طرح سے دانا ڈالا گیا تھا۔ بانس کا وہ ٹکڑا۔ یعنی ہمارا ہتھیار جان بوجھ کر اس نے ہاتھ سے گرایا تھا۔ اور یہ بھی پروگرام میں شامل تھا کہ وہ تمھارے ہاتھ لگ جائے۔ پھر ہم اسے حوالات سے نکال لائیں۔ تاکہ تم فوراً ادھر کا رُخ کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تمھارے استقبال کے لیے پہلے سے تیار تھے۔"

"بہت خوب! اتنی سادی کوشش کا مقصد [illegible]" انسپکٹر جمشید

مسکرا دیے۔

"باس یہاں رات کے وقت پہنچیں گے۔ وہی آپ کو بتا سکیں گے کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔"

"اور تم لوگوں کا باس کون ہے؟"

"ہم انھیں باس کے نام سے ہی پکارتے ہیں۔"

"کیا وہ بھی تم لوگوں کے ساتھ افریقہ سے آیا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ تو شروع سے یہیں ہے۔ لیکن اس کا حکم بہت دُور دُور تک چلتا ہے۔"

"تب تو ہم اس سے ضرور ملیں گے۔ دیکھیں تو سہی۔ وہ کون ہے۔"

"تم لوگ باس سے مل کر بھی، نہیں جان سکو گے کہ وہ کون ہے۔"

"اوہو۔ وہ کیوں۔ کیا وہ نقاب اوڑھے رہتا ہے؟"

"نہیں۔ اس کے باوجود تم اسے نہیں پہچان سکو گے۔"

"خیر۔ دیکھا جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اُچکائے۔

اکرام نے دیکھا۔ دروازے میں کئی آدمی تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں بانس کے ٹکڑے موجود تھے۔

"کیا دیکھ رہے ہو بھئی۔ ہم میں سے اگر صرف دو آدمی اپنے

ان ہتھیاروں کی پنیں دبا دیں تو آن کی آن میں تمہیں پانی بنا دیں۔ جب کہ ہم یہیں ہیں؟" سیاہ لبادے والا مسکرایا۔

"ہاں! ہم دیکھ سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم کون ہو؟"

"باس کی غیر حاضری میں میں ان کا انچارج ہوں۔ یہ میری ہدایات پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔"

"میں چاہتا ہوں۔ تم میں سے ایک مجھ پر سانپ چھوڑ دے۔" انسپکٹر جمشید عجیب سے لہجے میں بولے۔

"کک۔ کیا مطلب؟" سیاہ لبادے والا ہکلایا۔

"میں تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں پھرتیلا ہوں یا سانپ؟"

"یہ تو سیدھا موت کے منہ میں جاکودنے کی بات ہوگی۔" انچارج نے کہا۔

"پروا نہ کرو۔ تم اپنے کسی ساتھی کو حکم دو۔ وہ اپنے ہتھیار کی پن دبا دے۔ لیکن مجھے بتا کر ایسا کیا جائے۔ کہ کون پن دبائے گا۔"

"نہیں۔ میں ایسا حکم نہیں دوں گا۔" انچارج نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں دو گے؟" انسپکٹر جمشید بھرپور انداز میں مسکرائے۔ اکرام نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"اس لیے۔ اس لیے کہ۔" وہ اٹک کر رہ گیا۔ جملہ پورا نہ کر سکا۔

"بات مکمل کرو بھئی۔" انسپکٹر جمشید نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"کہ جو دیا کہ میں انہیں تم پر حملہ کرنے کا حکم نہیں دے سکتا۔"

"لیکن کیوں۔ اس کی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔"

"باس کا حکم۔" انچارج نے کہا۔ اور پھر اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔

"بہت خوب۔ تو باس کا حکم یہ ہے کہ ہمیں زندہ سلامت رکھا جائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں؟" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"بہت اچھے۔ مزا آ گیا۔ اکرام۔ اب ہمیں ان ہتھیاروں سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ آؤ۔ ان کی مرمت شروع کریں۔"

"کیا مطلب؟" انچارج بوکھلا گیا۔

"مرمت کا مطلب مرمت ہی ہوتا ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ زور سے اچھلے اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے ہی لمحے اکرام بھی حرکت میں آ چکا تھا۔

پل کے ٹکڑے ان میں سے کئی کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے اور ایک بے قاعدہ سی لڑائی شروع ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید پہلے ہی تین آدمیوں کو بے کار کر چکے تھے۔

ان کے ہاتھ پیر بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ چل رہے تھے۔
اکرام بھی اپنی پوری طاقت صرف کر رہا تھا۔ اُدھر۔ دشمن
مجبور تھے۔ اپنے ہتھیاروں کے ذریعے ان پر حملہ نہیں کر سکتے
تھے۔ تاہم ہاتھ پیر وُہ بھی ہلا رہے تھے، لیکن ان کی کوشش
صرف یہ تھی کہ ان دونوں کو بس بے ہوش کر دیا جائے،
کیوں کہ زیادہ نقصان تو وُہ انہیں پہنچا نہیں سکتے تھے۔ اس طرح
ان کی موت واقع ہو سکتی تھی۔ اور ان لوگوں کو اپنے باس
کی خدمت میں انہیں زندہ سلامت پیش کرنا تھا۔ نتیجہ یہ کہ
انسپکٹر جمشید اور اکرام تابڑ توڑ وار کر رہے تھے۔ اور وُہ بچ بچ کر۔
اور پھر انسپکٹر جمشید کا پھرتیلا پن انہیں یوں ہی چکرائے دے رہا تھا۔

یہ لڑائی صرف پندرہ منٹ جاری رہ سکی۔ پندرہ منٹ بعد
وُہ بیس کے بیس لیٹے نظر آئے:

"آؤ اکرام۔ ابھی انہیں باندھنا بھی ہے۔ تاکہ ہم پُرسکون
انداز میں باس صاحب سے ملاقات کر سکیں۔"

اکرام نے جیب سے ریشم کی باریک ڈوری نکالی اور
دونوں ان کے ہاتھ پیر باندھنے لگے۔ آخر میں انچارج کی باری
آئی۔ انھوں نے پہلے اس کا سیاہ لبادہ اُتارا، پھر باندھا۔
لبادے میں انھوں نے بانس کے تمام ٹکڑے باندھ لیے۔ اپنے
پستول بھی جیبوں میں ڈالے اور بانسوں کی گٹھڑی اٹھائے دراز

ـے جنگل آ گئے:

"اب ہمیں بہت دیر تک انتظار کرنا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کوئی بات نہیں سر۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔" اکرام نے
بے چارگی کے عالم میں کہا اور انسپکٹر جمشید مسکرا دیے۔ پھر رات
کے ٹھیک گیارہ بجے انھیں تاریکی میں سگریٹ کا ایک شعلہ نظر
آنے لگا۔ گویا باس سگریٹ کے کش لگاتا چلا آ رہا تھا۔ وُہ اس
کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔

مصیبت صاحبہ

"مُکا کچھ اس قدر زور دار تھا کہ محمود کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔ فاروق اور فرزانہ بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئے، لیکن اس وقت تک لمبا آدمی اندر داخل ہو چکا تھا اور اس کا رُخ فاروق کی طرف تھا۔

"اے۔ اے مسٹر۔ تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟"

"ہاں، دماغ چل گیا ہے۔ اور تمھارے بھی دماغ چلا دینے کا پروگرام ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے فاروق کی ناک پر مُکا دے مارا، لیکن محمود تو بے خبری میں مار کھا گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تیسرا "ملاقاتی" اچانک مُکا دے مارے گا۔ فاروق تو بے خبر نہیں تھا۔ وہ فوراً جھک گیا۔ "ملاقاتی" کا مُکا دیوار پر لگا اور اس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔

"کیوں بھئی۔ کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟" فرزانہ شوخ انداز میں بولی۔ وہ تلملا کر اس کی طرف مُڑا اور بایاں ہاتھ گھما دیا۔ فرزانہ

اس کے حملے کے لیے بالکل تیار تھی۔ دونوں پیروں پر اُچھلی اور دائیں طرف آ گئی۔ اس کا ہاتھ گھوم کر رہ گیا۔ ساتھ ہی وُہ خود بھی گھوم گیا۔ وہ کیا گھوما، فرزانہ کو موقع مل گیا، اپنا دایاں پاؤں اُٹھا کر اس کی کمر پر دے مارا۔ وہ اوندھے مُنہ گرا۔ اتنے میں محمود سنبھل چکا تھا۔ وہ ویسے بھی غصّے میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے فرزانہ کو "ملاقاتی" کی کمر پر چھلانگ لگاتے دیکھا تو پکار اُٹھا:

"نہیں فرزانہ۔ یہ میرا شکار ہے۔"

"بھئی مل کر بانٹ لینا۔ لڑو نہیں۔" فاروق مُسکرایا۔

محمود اس کے سر کی طرف آ گیا اور ایک ٹھوکر رسید کر دی۔

"یہ ہے اس مُکے کا جواب۔"

"بھئی واہ۔ میرا خیال تھا۔ جواب صرف سوال کا ہی ہوتا ہے، لیکن یہاں تو مُکے کا بھی جواب پیدا ہو گیا۔" فاروق نے کہا اور تیزی سے جھک کر "ملاقاتی" کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔ میں گر جاؤں گی۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا، کیوں کہ وُہ اس کی کمر پر اُچھل کود رہی تھی۔

"یہ کھیل کود کا میدان تو ہے نہیں کہ تم اُچھل کود رہی ہو۔ مہربانی فرما کر نیچے اُتر آؤ۔ میرے ٹانگیں پکڑ لینے کے بعد یہ صاحب بھاگنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکیں گے۔"

"اچھا تو پھر ایک ٹانگ تم پکڑ لو۔ دوسری میں۔ اس طرح معاملہ زیادہ محفوظ رہے گا۔"

"چلو یوں ہی سہی۔" فاروق مسکرایا۔

ادھر محمود دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ ایسے میں بیگم جمشید کی ہنستی آواز سنائی دی:

"بھئی بس کرو۔ کہیں جان سے نہ مار ڈالنا۔ ابھی تو ہمیں اس سے آمد کا مقصد بھی معلوم کرنا ہے۔"

"اوہ ہاں۔ ہم تو بھول ہی گئے۔ معاملہ تو ابھی صرف تعارف تک ہی طے ہوا ہے۔ تو پھر امی جان۔ رسی پھینک دیں۔"

فوراً ہی رسی کا لچھا پھینک دیا گیا۔ انھوں نے مل کر اسے باندھا اور صحن کی طرف گھسیٹنے لگے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نے دریا میں جال پھینکا ہو اور اس میں بہت سی مچھلیاں پھنس گئی ہوں۔ اور اب ہم جال کو کھینچ رہے ہوں۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"تمھیں ہو رہا ہوگا محسوس۔ ہمیں نہیں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"بھئی تم صرف اپنی بات کر سکتی ہو۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"چلو خیر۔ اپنے والی بات ہیں کر دیتے ہوں۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"لو۔ دشمن سے لڑتے لڑتے۔ اب آپس میں لڑنے لگے۔" باورچی خانے سے آواز آئی۔

"دشمن سے تو لڑائی ختم ہو چکی ہے امی جان۔" فاروق مسکرایا۔

صحن تک پہنچ کر وہ رک گئے۔ انھوں نے دشمن کو سیدھا کیا۔ وہ ہوش میں تھا:

"ہاں جناب۔ اب بتائیے۔ آپ نے کیسے یہاں تک آنے کی زحمت کی تھی۔ تعارف تو ہو چکا۔" محمود بولا۔

"تم لوگ اپنی مصیبت کو آواز دے چکے ہو۔"

"کیا مطلب۔ کیا یہ کام ہم نے تمھیں باندھ کر کیا ہے۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔"

"گویا ہم چپ چاپ تمھارے ہاتھ سے مار کھا لیتے تو پھر ہم اپنی مصیبت کو آواز نہ دیتے۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"اور اب مصیبت صاحب کس طرح تشریف لائیں گی؟"

"اگر تم میرے ہاتھ سے مار کھا لیتے تو میں یہاں سے نکل کر باس کو اطلاع دے دیتا کہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔ لیکن اب میں اطلاع نہیں دے سکوں گا۔ نتیجے میں باس یہاں پہنچ جائے گا اور تم میرے باس کو نہیں جانتے۔

وہ بہت خوف ناک چیز ہے۔"

"چلو یہ اور اچھی بات ہے۔ اسی بہانے جان جائیں گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

کلاقاق نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور پھر نفرت سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تمھارا باس ہماری مرمت کیوں کرانا چاہتا تھا۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟"

"یہ تو وہی جانے۔ اس سے سوال کرنا۔ یہاں اس کا آنا اب ضروری ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم اس سے ضرور پوچھیں گے۔" یہ کہ کر محمود ان کی طرف مڑا۔

"اگر اس شخص کی بات درست ہے۔ اور اس کا باس یہاں آنے والا ہے تو ہمیں اس کے استقبال کی تیاری بھی شروع کر دینی چاہیے۔ کیا خیال ہے؟"

"ہوں ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے اس کی آواز بند کرنا ہوگی۔" فرزانہ نے کہا۔

انھوں نے اس کے منہ میں ایک رومال ٹھونسا اور اوپر سے دوسرا رومال باندھ دیا۔ پھر اسے اٹھا کر سٹور میں بند کر دیا۔

"امی جان۔ آپ اپنی تیاری مکمل کر لیں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن میری ایک تجویز ہے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"جی فرمائیے۔ ہم آپ کی تجویز پورے ذوق اور شوق سے سننے کے لیے تیار ہیں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"شاید تم لوگوں کو ہوٹل انشارجہ جانے سے روکنے کے لیے اس شخص کو بھیجا گیا تھا۔ اور اب اس نے اپنے باس کی آمد کی اطلاع دے کر تمھیں کچھ اور دیر کے لیے یہاں روک لیا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ تم تینوں ہوٹل چلے جاؤ۔ اور میں دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہوں۔"

"اور اگر باس چھت کے راستے اوپر آ گیا تو؟" محمود بولا۔

"تو کیا ہوا۔ میں اس سے نبٹ لوں گی۔"

"نہیں امی جان۔ ہم آپ کو خطرے میں نہیں چھوڑ سکتے۔"

"لیکن تم لوگوں کا ہوٹل انشارجہ جانا بھی ضروری ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔

"تب پھر اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم فرزانہ کو آپ کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔"

"چلو یوں ہی سہی۔" بیگم جمشید فوراً بولیں۔

"فرزانہ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"نہیں۔ تجویز معقول ہے۔"

"اچھا تو پھر ہم دونوں چلتے ہیں۔ تم دروازہ اندر سے بند
کر لو۔ تمھاری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اندر داخل نہ
ہو سکے۔"
"نہیں۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ وہ اندر داخل ہو جائے
اور نکل کر نہ جا سکے۔" وہ مسکرائی۔
"خیر۔ تمھاری مرضی۔ ہم تو اس لیے کہہ رہے تھے کہ تم
کوئی خطرہ نہ مول لے لو۔"
"دیکھا جائے گا۔ گھر آنے والے مہمان کو دروازے سے
لوٹا دینا ہماری روایت نہیں۔" فرزانہ پُر سکون آواز میں بولی۔
"بات یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا۔ اللہ حافظ۔" محمود نے کہا۔
"اللہ حافظ۔" ان دونوں نے ایک ساتھ کہا۔
دونوں گھر سے نکل کر موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت
انھوں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔
"معاملہ حد درجے پُر اسرار ہو گیا ہے۔" محمود بڑبڑایا۔
"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔ ادھر ابا جان اب تک
نہیں لوٹے۔"
"میں حیران ہوں۔ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں۔ کیا سارا معاملہ ان
دو مہمانوں کی گم شدگی کا ہے؟"
"نظر تو یہی آتا ہے، کیوں کہ تیسرے ملاقاتی نے دروازہ

کے ہی انھی کے بارے میں پوچھا تھا۔"
"خیر۔ دیکھتے ہیں۔ ہوٹل افشارجہ میں کیا معاملہ سامنے آتا ہے۔"
ود نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔
ہوٹل افشارجہ تک پہنچنے میں انھیں بائیس منٹ لگے۔ انھوں
نے موٹر سائیکل کھڑی کی اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے
پر ایک باوردی چوکیدار کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی۔
رائفل کی موجودگی نے انھیں الجھن میں ڈال دیا، کیوں کہ یہ کسی
ک کا نہیں۔ ہوٹل کا دروازہ تھا۔ اس سے پہلے انھیں ہوٹل
افشارجہ آنے کا شاید کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ یا اگر وہ کبھی آئے بھی
تھے تو اس وقت چوکیدار کے ہاتھ میں رائفل نہیں رہی ہوگی۔
"خیر تو ہے جناب۔ آپ کے ہاتھ میں رائفل کیوں ہے؟"
"آج ہوٹل میں کچھ اہم مہمان آ رہے ہیں۔ ان کے پاس
ت قیمتی ہوں گے۔ ان پر ہیرے جواہرات ٹنکے ہوں گے،
کیا خبر کوئی چور اچکا کسی ہیرے پر ہاتھ صاف کر کے فرار ہونے
کی کوشش کرے۔ اسی لیے آج رائفل کی ضرورت محسوس کی
گئی ہے۔"
"لیکن وہ مہمان کون ہیں؟"
"جنوبی افریقہ کے دو شہزادے ہیں۔ ہمارے ملک کی سیر کے لیے
آئے ہوئے ہیں۔ آج رات [illegible] ہوٹل [illegible]

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ اندر جانے کے لیے آگے بڑھے۔
"لیکن آپ لوگ کہاں گھسے جا رہے ہیں؟"
"کیوں۔ کیا اندر جانا منع ہے؟"
"آج کے دن تمام سیٹیں بک ہو چکی ہیں"
"اوہ۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ ہم بہت بُرے کو بہت اچھے میں تبدیل کرنا جانتے ہیں" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ مینجر صاحب ہمارے لیے مخصوص سیٹوں کا انتظام کر دیں گے"
"وہ۔ وہ کیسے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔
"اس لیے کہ ہم بھی کسی شہزادے سے کم نہیں۔ اگر وہ ہمارے لیے سیٹوں کا انتظام نہ کریں تو جو چور کی سزا وہ ہماری"
"تب پھر آپ شوق سے اندر جائیے" اس نے مسکرا کر کہا۔
وہ اندر داخل ہوئے اور پھر ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی، پھر ان کے قدم ایک سمت میں اٹھنے لگے۔ اب انھیں سیٹوں کے لیے مینجر سے ملنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ایک میز کے پاس رکتے ہوئے محمود نے دبی آواز میں کہا:

"السلام علیکم!"
"ارے۔ وعلیکم السلام" خان رحمان کی حیرت زدہ آواز ابھری۔
"آپ اور یہاں؟"
"یہ بات تو میں بھی تم سے کر سکتا ہوں۔ تم اور یہاں؟"
"جی ہاں! ہم اور یہاں۔ آپ کی میز پر کوئی اور تو نہیں بیٹھا۔"
"نہیں۔ میں نے پوری میز بک کروائی تھی"
"بھئی واہ۔ مزا آ گیا" دونوں نے ایک ساتھ کہا اور بیٹھ گئے۔
"تم نے بتایا نہیں۔ یہاں کیسے آ گئے"
"پہلے آپ بتائیے نا۔ آپ کیسے آ گئے"
"آج یہاں دو افریقی شہزادے آ رہے ہیں۔ میں ان سے ملاقات کروں گا"
"کیوں۔ کیا ضرورت پڑ گئی؟"
"ان کے پاس سونے کی کچھ کانیں ہیں۔ میں نے سنا ہے، وہ ان کا سودا کرنا چاہتے ہیں"
"اور آپ وہ کانیں لینا چاہتے ہیں" محمود نے بوکھلا کر کہا۔
"ہاں، لیکن اس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے"
"ہم آپ کو مشورہ نہیں دیں گے، کیوں کہ یہاں کوئی بڑا

پکچر چلنے والا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کر رکھا کہ ضرور
ہی خریدوں گا۔ میں تو بس اس نظریے سے چلا آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اب تم بتاؤ۔ تم لوگ کیوں آئے ہو؟"

"ہماری کہانی ذرا لمبی ہے۔"

"ابھی شہزادوں کے آنے میں دیر ہے۔ تم اپنی کہانی سنا
سکو گے۔" وہ بولے۔

"بہت بہتر۔" محمود نے کہا اور تینوں ملاقاتیوں کی کہانی
سنا دی۔

"گویا تم صرف اس لیے یہاں آئے ہو کہ کوئی شخص نہیں چاہتا
تھا کہ تم یہاں آؤ۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں! بس یہی بات ہے۔"

"معاملہ واقعی پُر اسرار ہے۔ جمشید کیوں ساتھ نہیں آیا؟"

"وہ آج دفتر سے گھر نہیں آئے۔ کہیں اور مصروف ہیں۔"

"ہوں خیر۔ اس کی بجائے میں تم لوگوں کے ساتھ شامل ہو
گیا ہوں۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں! یہ تو ہے۔"

عین اسی وقت بگل بجنے لگا:

"یہ شہزادوں کی آمد کا اعلان ہے۔" خان رحمان بولے۔

انھوں نے دیکھا۔ سب لوگوں کی نظریں ہوٹل کے دروازے
کی طرف اٹھ گئیں۔ دروازے پر زرد رنگ کی ایک مرسڈیز کار
آ کر رک چکی تھی۔

دوسرے ہی لمحے انھوں نے بالکل سیاہ رنگ کے دو نوجوانوں
کو کار سے اترتے دیکھا۔ ان کے جسموں پر بالکل سفید لباس تھا،
اور اس لباس میں واقعی ہیرے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔
ہوٹل کا عملہ دروازے کے دونوں طرف باادب کھڑا ہو چکا تھا،
اور پھر وہ ان کے درمیان سے گزر کر دروازے میں داخل
ہوئے۔ بیرے ان پر پھول برسا رہے تھے۔ ساتھ ہی ہوٹل
کے اندر ساز بجنے لگا۔

یہاں تک کہ دونوں شہزادے دروازے میں داخل ہو گئے۔
فوراً ہی ایک لمبے قد کے آدمی نے آگے بڑھ کر دو دو ہار ان
کے گلوں میں ڈال دیے۔ تمام ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لمبا آدمی
تالیوں کی گونج میں کہہ رہا تھا،

"خادم اس ہوٹل کا مینجر ہے۔ مینجر ڈوبام۔"

شہزادوں نے اپنے لباس میں سے ایک ایک ہیرا توڑا اور
مینجر کی طرف اچھال دیا۔ مینجر نے پھرتی سے انھیں کیچ کر لیا
اور جھک کر بولا:

"خادم شکریہ ادا کرتا ہے۔ آگے تشریف لے چلیے۔"

اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہال کی طرف بڑھنے لگے، پھر ان کے دل دھڑک اٹھے، کیوں کہ شہزادوں کے لیے جو میز سجائی گئی تھی، وہ ان کے میز کے بالکل نزدیک تھی۔

"اوہو۔ یہ تو ہمارے نزدیک ہی بیٹھیں گے۔ انکل۔ کیا آپ نے اس کی کوشش کی تھی؟"

"نہیں بھئی۔ یہ بغیر کوشش کے ہی ہو گیا۔" وہ مسکرائے۔

اتنے میں دونوں شہزادے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چار بیرے ان کی میز کے نزدیک اٹنشن کھڑے تھے۔ ایک شہزادے نے بیٹھنے کے بعد کہا:

"مسٹر ڈوہام۔ آپ بھی ہمارے ساتھ تشریف رکھیے۔"

"ہم۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ کہ آپ مجھے یہ عزت عطا فرما رہے ہیں۔" مینجر نے خوش ہو کر کہا اور جلدی سے تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارے جملے پر خوشی ہوئی۔ اس جملے پر بھی تم انعام کے حق دار ہو۔" ایک شہزادے نے کہا اور اپنے لباس سے ایک ہیرا توڑ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرے شہزادے نے بھی یہی کیا۔

"اُف۔ شاید ان کے ملک میں ہیرے کھیتوں میں اُگتے ہیں۔"

فاروق نے جل کر کہا۔

"تو تم کیوں جلے جا رہے ہو۔" محمود مسکرایا۔

"کیا یہ یہاں ہیرے لٹانے آئے ہیں؟"

"نظر تو یہی آتا ہے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

اچانک محمود کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی۔ فاروق نے یہ تبدیلی فوراً ہی محسوس کر لی۔ اس نے کہا:

"خیر تو ہے محمود۔ کیا بات ہے؟"

"فاروق۔ جو ہیرے شہزادوں نے مینجر کو دیے ہیں۔ وہ ہمیں اڑانا ہوں گے۔" اس نے دبی آواز میں کہا۔ خان رحمان ٹھٹکے۔

"کیوں۔ ہم کیا کریں گے۔ ان کا؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس۔ کہہ جو دیا۔ ہمیں یہ کام کرنا ہے۔"

"اچھا۔ کر لیں گے۔" فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"اور اس کے لیے ہمیں پہلے سے مینجر کے کمرے میں جا کر چھپنا ہوگا۔"

"لیکن ہمیں کیا معلوم کہ مینجر کا کمرہ کون سا ہے۔ اور پھر کیا اس کا کمرہ کھلا ہوگا؟"

"کمرہ کھولنا مشکل نہیں ہوگا ہمارے لیے۔ صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ کمرہ کون سا ہے۔ آؤ۔ جلدی کرو۔" محمود نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ خان رحمان نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا:

"آپ میز پر ہی رہیں انکل۔ ہمیں کچھ کام کرنا ہے یہاں۔" محمود بولا۔

"اچھا!" ان کے منہ سے نکلا۔

دونوں آہستہ انداز میں چلتے ہوٹل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے، پھر جوں ہی راستے میں انہیں ایک بیرا ملا۔ محمود بول اٹھا:

"مینیجر صاحب کا کمرہ کون سا ہے؟"

"کیوں۔ وہ تو ہال میں موجود ہیں۔"

"ایک بہت ہی اہم بات ہے جناب۔ جلدی بتائیے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"اہم بات ہے۔" اس نے حیران ہو کر کہا، پھر جلدی سے بولا: "دوسری منزل پر نواں کمرہ ان کا ہے، لیکن بتائیے تو سہی۔ بات کیا ہے؟"

"بتانے کے لیے ہمیں مینیجر صاحب سے اجازت لینا پڑے گی اور ابھی وہ اجازت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔" یہ

[کہتے] ہی وہ آگے بڑھ گئے اور بیرا انہیں گھورتا ہی رہ گیا۔ دوسری منزل پر کمرہ نمبر نو کے سامنے رک کر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ برآمدے میں کوئی بھی نہیں تھا، ہوتا بھی کون، اس وقت تو سارا ہوٹل ہال میں جمع تھا اور شہزادوں کو دیکھ رہا تھا۔ محمود نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ماسٹر کی آزمائی، پہلی ہی کوشش میں دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے اندر داخل ہو کر پھر تالا لگا دیا۔

یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ اور ہر قسم کے ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ انہوں نے چھپنے کی جگہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔

"غسل خانہ کیسا رہے گا۔" محمود بولا۔

"اور اگر وہ آتے ہی غسل خانے میں آ گھسا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تب پھر یہ کھڑکی بہتر رہے گی۔ اس کے پردے کے پیچھے ہم باآسانی چھپ سکتے ہیں۔"

"جی نہیں۔ پردے کھڑکی کے نچلے حصے کو نہیں چھو رہے، ہمارے جوتے نظر آ سکتے ہیں۔"

"تب پھر۔ ادھر تو کوئی ایسی جگہ نہیں۔"

"چھپنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیوں۔ کیا کوئی تجویز ہے ذہن میں۔" محمود نے حیران ہو

کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہے۔" وہ مسکرایا اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگا۔

اور پھر آخر آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر تالے میں چابی گھومنے کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ دونوں یک دم تیار ہو گئے۔

افریقی شہزادے

سگریٹ کا شعلہ آہستہ آہستہ نزدیک آتا چلا گیا، پھر فضا میں ایک سیٹی گونج اٹھی۔ وہ چونک گئے۔ نہ جانے اس سیٹی کا کیا مطلب تھا۔ اچانک شعلہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب ان کی آنکھوں کے سامنے تاریکی ہی تاریکی تھی۔

"شاید سیٹی نے گڑبڑ کر دی۔" وہ بڑبڑائے۔

"جی ہاں! سیٹی اسی نے بجائی تھی۔ یہ اشارہ تھا اس کے آدمیوں کے لیے کہ وہ آ گیا ہے، لیکن جب اسے سیٹی کا جواب نہ ملا تو گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ اس نے فوراً سگریٹ بجھا دی اور خود نیچے بیٹھ گیا۔ اب یا تو وہ واپس لوٹ جائے گا، یا چھپ کر آگے آئے گا، تاہم ہمارے لیے صورتِ حال خراب ہو گئی ہے۔"

"ہوں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب ایک ہی حل ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم ڈراڈر کے پاس پہنچ جائیں۔ اگر وہ آیا تو ڈراڈر کی

طرف ہی آئے گا۔"

"جی بہتر۔ چلیے۔"

دونوں آہٹ پیدا کیے بغیر ڈرائنگ کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے پنسل ٹارچ کی روشنی نہیں کی تھی۔ ڈرائنگ کے اندر ضرور روشنی ڈال کر دیکھا۔ تمام افریقی جوں کے توں پڑے نظر آئے۔ اب وہ انتظار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک گھنٹہ گزر گیا۔

"نہیں بھئی۔ وہ بہت چالاک ہے۔ واپس لوٹ گیا ہے۔ اس نے اپنے ان ساتھیوں کی بھی پروا نہیں کی۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"پھر اب کیا کریں؟"

"شہر سے مدد لانا ہو گی۔ تاکہ ان سب کو حوالات میں منتقل کیا جا سکے۔ وہیں ان سے پوچھ گچھ کر لی جائے گی۔ تاہم میں جانتا ہوں۔ ان لوگوں کو باس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ معلوم ہوتا تو وہ کبھی بھی چپ چاپ پڑے نہ رہ سکتے۔"

"ہوں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں حیران ہوں۔ باس چاہتا کیا ہے۔ پہلے اس نے اپنے آدمی کے ذریعے آپ پر حملہ کرایا، پھر جب آپ نے اس کو حوالات پہنچا دیا تو اس کے آدمی اسے حوالات سے چھڑا لائے۔ اس سے آپ نے یہ اندازہ

لگایا کہ وہ لوگ ان پہاڑیوں میں ہی کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ بات بالکل بھی یہی۔ ان لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ ان کے باس کا پروگرام بھی یہی تھا کہ آپ کو ادھر گھیر لایا جائے۔ اور اب باس پروگرام کے مطابق آپ سے بات کرنے آ رہا تھا، لیکن خطرہ دیکھ کر واپس چلا گیا۔ کیا سب حالات عجیب و غریب نہیں ہیں؟"

"بالکل ہیں۔ آؤ اب ہم مدد لینے کے لیے چلتے ہیں۔" وہ بولے۔

"آپ کا مطلب ہے۔ ہم دونوں جائیں گے۔ کیا ہم میں سے ایک کو یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔" اکرام بولا۔

"نہیں! یہاں ٹھہرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ اب وہ ادھر نہیں آئے گا۔ اسے یقین ہو چکا ہے کہ اس کے سب ساتھی پکڑے جا چکے ہیں۔ ہمیں ان سب کو خفیہ طور پر رکھنا ہوگا۔ تاکہ وہ پھر اپنے ساتھیوں کو چھڑا کر نہ لے جائے۔"

آخر وہ واپس روانہ ہوئے۔ اکرام کو ہدایات دے کر انسپکٹر جمشید جب گھر پہنچے تو دروازہ کھلا تھا۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ان کے گھر کا دروازہ کسی صورت بھی کھلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ ہدایات یہی تھیں کہ اگر کسی ضرورت کے تحت دروازہ کھولا جائے تو فوراً بند بھی کیا جائے۔ اس لیے دروازے کا کھلا

ملنا عجیب بات تھی اور خطرناک بھی ؛ تاہم انھوں نے آؤ دیکھا نہ
تاؤ۔ پستول ہاتھ میں لیا اور اندر داخل ہو گئے۔ ساتھ ہی انھوں
نے ہانک لگائی :

"بیگم۔ تم کہاں ہو؟"

بیگم جمشید کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب انھوں نے
بوکھلاہٹ کے عالم میں باورچی خانے اور پھر ایک ایک کرکے تمام
کمرے دیکھ ڈالے۔ جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ گھر میں کوئی بھی
نہیں تھا۔ اب وہ بیگم شیرازی کے دروازے پر آئے۔ دستک
دی تو انھوں نے دروازہ کھولا :

"خیر تو ہے بھائی جان" وہ ان کے چہرے کے تاثرات
بھانپ کر بولیں۔

"گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ دروازہ مجھے کھلا ملا ہے ،
اس کا مطلب ہے۔ آپ کو بھی کچھ معلوم نہیں ، خیر" یہ کہ کر
وہ پھر گھر میں آئے۔ اب انھوں نے اطمینان سے ایک ایک
کمرے کا جائزہ شروع کیا اور آخر لائبریری میں داخل ہو گئے
دوسرے ہی لمحے وہ زور سے اُچھلے۔ مارے حیرت کے ان
کی آنکھیں پھیل گئیں ، پھر حیرت میں خوف اور دہشت شامل
ہو گئے۔ پورا کمرہ جل کر راکھ ہو چکا تھا ، لیکن عجیب بات
یہ تھی کہ دروازے اور دیواریں نہیں جلی تھیں۔ صرف کتابیں

ل تھیں۔

تھکے تھکے قدم اٹھاتے وہ باہر آئے اور فون کا ریسیور اٹھا
کر متعلقہ تھانے کو فون کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے بعد پولیس آ
گئی۔ ان کے دفتر کا عملہ بھی آ گیا۔ لائبریری دیکھ کر ان
کی آنکھیں بھی پھیل گئیں :

"حیرت ہے۔ آخر آگ کس طریقے سے لگائی گئی۔ جس نے
صرف کتابوں کو جلایا۔ دروازے اور دیواروں کو کچھ نہیں کہا۔"

"اسی بات پر میں حیران ہوں۔ ویسے میں اندازہ لگا
سکتا ہوں" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور وہ کیا؟"

"یہ کہ ان کے پاس الیکٹرک برنر کی قسم کا کوئی آلہ تھا۔
اس آلے کا رُخ انھوں نے صرف کتابوں کی طرف کرکے بٹن آن
کر دیا۔ اس طرح تمام کتابیں جل کر راکھ ہو گئیں۔"

"جی ہاں ؛ یہی بات ہو سکتی ہے ، لیکن ان لوگوں کو آپ
کی لائبریری سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"شاید میری لائبریری میں ان لوگوں کے خلاف کوئی بہت
زبردست قسم کا ثبوت موجود تھا" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"سوال یہ ہے سر۔ آپ کے گھر کے افراد کہاں ہیں؟"

"اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ انھیں ساتھ

لے گئے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"آپ لوگ یہاں کارروائی مکمل کریں۔ میں ان کی تلاش میں نکلتا ہوں۔"

"جی بہتر۔"

انھوں نے پہلے خان رحمان کے گھر فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا، خان رحمان گھر میں نہیں ہیں۔ محمود وغیرہ بھی وہاں نہیں پہنچے۔ اب انھوں نے پروفیسر داؤد کے نمبر ملائے:

"ہیلو پروفیسر صاحب۔ محمود وغیرہ ادھر تو نہیں آئے؟"

"نہیں۔ خیر تو ہے۔ تمھاری آواز سے پریشانی جھانک رہی ہے۔"

"جی ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"شاید تم بتانے کے موڈ میں نہیں ہو، خیر۔ میں پھر معلوم کر لوں گا۔ کیا تم خان رحمان کے گھر سے معلوم کر چکے ہو؟"

"ہاں۔ خان رحمان تو گھر میں نہیں ہیں۔ بہرحال وہ لوگ بھی ادھر نہیں پہنچے۔"

"خان رحمان تو آج ہوٹل الشارجہ میں ہوں گے اس وقت۔ وہاں دو افریقی شہزادوں کو آنا تھا۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ افریقی شہزادوں کو آنا تھا۔" ان کے منہ

سے نکلا۔

"ہاں! لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔" انھوں نے بھی حیران ہو کر کہا۔

"میرے خیال میں حیرت کی بات ہے۔ تفصیل پھر بتاؤں گا۔" یہ کہتے ہی انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔ اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتے باہر نکلے۔ جیپ میں بیٹھے اور ہوٹل الشارجہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہوٹل کا دروازہ انھیں بند ملا۔ باہر بہت سے لوگ ضرور موجود تھے۔

"خیر تو ہے بھئی۔ دروازہ کیوں بند ہے؟"

"افریقی شہزادے آچکے ہیں جناب۔ اندر اب کوئی جگہ نہیں، اس لیے دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔"

"اوہ۔ اچھا۔" وہ بولے۔ اور قدم آگے بڑھا کر دستک دی، لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔ اب انھوں نے اور زور سے دستک دی، تو دروازہ کھل گیا۔

"بھئی کیا بدتمیزی ہے۔ کہہ جو دیا۔ اندر کوئی جگہ نہیں۔"

چوکیدار کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا اور خود اندر داخل ہو گئے۔ چوکیدار کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ فوراً ان کے راستے

میں آگیا:

"آپ۔ آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا جناب؟"

"اگر تم راستے سے ہٹ رہے گئے تو دماغ چلنے میں کوئی کسر نہیں رہ جائے گی"

چوکیدار ان کے لہجے سے سہم گیا۔ وہ انھیں پہچانتا نہیں تھا، ورنہ راستے میں نہ آتا۔ اب وہ سیدھے کاؤنٹر کی طرف بڑھے، لیکن پھر انھوں نے اپنا رُخ بدل دیا، کیوں کہ انھیں خان رحمان نظر آگئے تھے۔ خان رحمان اور باقی سب لوگ پوری طرح افریقی شہزادوں کی طرف متوجہ تھے۔ یہاں دبے پاؤں چلتے، غیر محسوس انداز میں خان رحمان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھیں کرسی گھسیٹنی بھی نہیں پڑی تھی، کیوں کہ پہلے ہی پیچھے ہٹی ہوئی تھی۔ اس طرح خان رحمان کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب کرسی پر بیٹھ گئے۔ اب انھوں نے بھی افریقی شہزادوں کی طرف دیکھا۔ وہ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ان کے لباس میں جا بجا ہیرے ٹنکے ہوئے تھے۔ اس قسم کا لباس دیکھ کر انھیں ہنسی آگئی۔ یہ تو بہت پرانے زمانے کا لباس تھا۔ پرانے زمانے کے بادشاہ ایسے لباس پہنتے رہے ہوں گے۔ اور پھر وہ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ عین اسی وقت خان رحمان کو احساس ہو گیا کہ کوئی ان کی میز پر آ بیٹھا ہے۔

"بھئی یہ کیا۔ ارے۔ جمشید۔ یہ تم ہو۔" خان رحمان نے چونک کر کہا۔

"ہاں خان رحمان۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں ذرا ان شہزادوں سے ملنے آگیا تھا۔" انھوں نے جھینپ کر کہا۔

"کیوں۔ ان میں کیا خاص بات ہے۔ کیا ان کے ہیرے تمہیں ادھر کھینچ لائے ہیں؟"

"نہیں۔ گولی مارو ہیروں کو۔ میں تو ان سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ دراصل ان کے پاس سونے کی چند کانیں ہیں اور میں نے سنا ہے۔ یہ انھیں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

"سونے کی کانیں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر ان میں سے سونا نکلنا بند ہو گیا ہو گا۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس طرح کانیں تھوڑا ہی خرید لوں گا۔ پہلے میرے ماہرین ان کا جائزہ لیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"سوال یہ ہے کہ انھیں فروخت کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ ان کے تو پاس میں کروڑوں کے ہیرے موجود ہیں۔"

"یہ بات تو خیر میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ ویسے میں

نے اس پہلو پر خاص توجہ بھی نہیں دی۔"

"تو پھر خان رحمان۔ تم ان سے کانوں کے بارے میں بات ضرور کرو۔" انسپکٹر جمشید کچھ سوچ کر بولے۔

"لیکن کیوں۔ کیا بات ہے؟" خان رحمان حیران رہ گئے۔

"پتا نہیں۔ کچھ بات ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے، کوئی بات بن ہی جائے۔"

"اب تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بات کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ محمود اور فاروق بھی ہوٹل میں موجود ہیں۔"

"ارے!" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! وہ اندر گئے ہیں۔ نہ جانے کیوں۔ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں سُن سکا تھا۔"

"اوہ۔ تت۔ تو کیا فرزانہ بھی ان کے ساتھ تھی؟"

"نہیں تو۔ فرزانہ تو ان کے ساتھ نہیں تھی۔"

"ہوں۔ نہ جانے کیا چکر چل رہا ہے۔ اور کیا ہونے والا ہے۔ خیر دیکھتے ہیں۔"

"بات کیا ہے جمشید۔ تم بہت فکر مند ہو۔" خان رحمان بھی فکر مند ہو گئے۔

"ذرا صبر کرو۔ پہلے ان شہزادوں سے فارغ ہو لو۔" انھوں نے کہا اور دونوں شہزادوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آئیے جناب۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ آپ میرے ساتھ نوش فرمائیں۔ یعنی میرے کمرے میں۔"

"اوہ اچھا اچھا۔" ایک شہزادے نے کہا۔

تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"خان رحمان۔ تم کیا بات کرو گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"مجھے نہیں معلوم تھا۔ یہ ان دونوں کو اپنے کمرے میں لے جائے گا۔ اب ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"نہیں بھئی۔ اب تم میرے پروگرام کے مطابق عمل کرو گے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ہم منیجر کے کمرے میں ہی سونے کی کانوں کے بارے میں بات کریں گے۔"

"ہم۔ تو کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گے جمشید۔" خان رحمان کے لہجے میں اور بھی حیرت شامل ہو گئی۔

"ہاں! میں بھی چلوں گا۔"

"ابھی تو کہہ رہے تھے کہ میں ان کانوں کا کیا کروں

لگا:

"وہ میں تمھارے لیے کر رہا تھا - اب میں اپنے لیے تمھارا
ساتھ دے رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کل مجھ پر ایک افریقی آدمی نے حملہ کیا۔ آج میں افریقی
آدمیوں نے حملہ کیا۔ یہاں بھی دو افریقی شہزادے موجود ہیں
ادھر محمود اور فاروق یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ اب تم س
ہی سکتے ہو کہ ان حالات میں میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔" انسپکٹر جم
نے جلدی جلدی کہا۔

"اُف اللہ! یہ تو کوئی لمبا چوڑا چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں! واقعی۔ تم اس میں لمبائی کے ساتھ چوڑائی بھی ش
کر سکتے ہو۔" وہ مسکرائے۔

اس وقت تک مینیجر دونوں شہزادوں کے ساتھ لفٹ م
جا چکا تھا۔ دونوں اُٹھے اور زینے کا رُخ کیا۔

"انھیں نہ جانے کون سی منزل پر جانا ہے۔" خان ر
گھبرا کر بولے۔

"میں اس ہوٹل میں پہلے بھی آ چکا ہوں بھئی۔ مینیجر کا
دوسری منزل پر ہے۔" وہ بولے۔

"اوہ اچھا۔"

وہ سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل پر پہنچے۔ اسی وقت
انھوں نے ایک افریقی شہزادے کو چیختی آواز میں کہتے سنا:

"پولیس کو بلاؤ بھئی - اندر گڑبڑ ہے۔"

ساتھ ہی افریقی شہزادے کا چہرہ کمرے میں غائب ہو گیا۔
کمرے کا دروازہ بند کر لیا گیا - انسپکٹر جمشید تیزی سے آگے
بڑھے۔

پہلا فائر

اُن کے جانے کے بعد فرزانہ نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"مقابلے کی تیاری کر لیجیے امی جان" اس نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں اپنی تیاری مکمل کر رہی ہوں، تم اپنی۔"
وہ مسکرائیں۔

دونوں تیاری میں لگ گئیں۔ آخر ٹھیک پندرہ منٹ بعد دستک ہوئی۔ فرزانہ نے اپنی امی کو اشارہ کیا کہ تیار رہیں اور خود دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور دروازے کے ساتھ ہی پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ ہاکی سٹک اس کے ہاتھ میں تیار تھی، لیکن چند سیکنڈ گزرنے پر بھی کوئی اندر نہ داخل ہوا، اب تو اسے حیرت ہوئی۔ اور اس نے خود کو دروازے پر ظاہر کر دیا۔ فوراً ہی کوئی چمک دار چیز اس کے منہ سے ٹکرائی۔ آنکھوں کے آگے جھماکا سا ہوا اور وہ تیورا کر گری۔ دوسرے ہی لمحے کوئی اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر

دیا گیا، پھر ایک آواز گونجی:

"تمہاری بیٹی میری زد میں ہے اور بے ہوش پڑی ہے۔ اندر سے باہر نکل آؤ۔ ورنہ میں اسے ختم کر دوں گا۔ میرے ہاتھ میں بے آواز پستول ہے۔"

بیگم جمشید کی تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ ان کا رنگ اڑ گیا، اپنے ہتھیاروں کو بھول کر وہ تیزی سے باورچی خانے سے نکلیں اور صحن میں آ گئیں:

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟"

"میرا ساتھی کہاں ہے؟"

"اندر بندھا پڑا ہے۔"

"اسے کھول دو۔ ورنہ میں اس بچی کو گولی مار دوں گا۔"

"اچھا!" انھوں نے کہا اور جلدی سے اس کمرے میں داخل ہو گئیں جس میں حملہ آور بندھا پڑا تھا۔ انھوں نے اسے جلدی جلدی کھول ڈالا۔ وہ ہوش میں تھا آزاد ہوتے ہی باہر نکلا۔ اور صحن میں کھڑے نقاب پوش کو دیکھ کر ٹھٹک گیا:

"باس۔ یہ آپ تو نہیں؟"

"اور کیا میرا فرشتہ یہاں کھڑا ہے۔ چلو۔ اس خاتون کو اسی رسی سے باندھ لو... جس سے انھوں نے تمہیں باندھا تھا۔"

"او کے باس!" اس نے خوش ہو کر کہا۔ جلد ہی بیگم جمشید

اور فرزانہ بندھی نظر آئیں :

"باہر وین کھڑی ہے۔ ان دونوں کو اس میں ڈال دو۔ میں اپنا کام مکمل کر لوں" اس نے کہا۔ کمروں کی طرف بڑھا ایک ایک کر کے اس نے سب کمرے دیکھ ڈالے، پھر آخر میں لائبریری کے اندر داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس کا ساتھی اندر آیا اور لائبریری کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ساتھی کے منہ سے نکلا :

"ارے باپ رے۔ یہ کیا باس؟"

"چپ رہو۔ بس خاموشی سے نظارہ دیکھو"۔ باس کی چہکتی آواز سنائی دی۔

بیس منٹ بعد وہ باہر نکلے اور دروازہ کھلا چھوڑتے ہوئے وین کی طرف بڑھے :

"لیکن باس! اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس بات کو چھوڑو۔ ضرورت کو میں جانتا ہوں۔ تم لوگ تو بس احکامات کی تعمیل کرتے رہو۔ پھر دیکھو۔ ہوتا کیا ہے بہر حال اس وقت ہمارے تمام پروگرام معمول کے عین مطابق ہو رہے ہیں۔ کہیں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی"۔ اس کے لہجے میں فخر اور غرور کی جھلک تھی۔

"لیکن باس۔ انسپکٹر جمشید کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"شاید اس وقت تک اس کا کاٹ بھی نکل چکا ہوگا اور اگر وہ کسی صورت بچ بھی گیا تو بھی فکر کی کوئی بات نہیں"۔

"آپ کی باتیں آپ ہی جانیں"۔ ساتھی نے کندھے اچکائے۔ دوسرے ہی لمحے وین وہاں سے روانہ ہوئی۔ اب اس کا رخ شہر کی جنوبی سڑک کی طرف تھا۔

جوں ہی دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ محمود اور فاروق کے ہاتھ چل گئے۔ لکڑی کے دونوں ڈنڈے زور سے اندر آنے والے کے سر میں لگے، وہ چکرا کر گرا۔ لیکن ساتھ ہی محمود اور فاروق بوکھلا اٹھے، کیوں کہ دونوں افریقی شہزادے بھی اندر داخل ہو گئے تھے اور بوکھلائے ہوئے انداز میں اس منظر کو دیکھ رہے تھے، پھر اچانک ان میں سے ایک نے سر کمرے سے باہر نکالا اور چلا اٹھا :

"پولیس کو بلاؤ جلدی۔ اندر گڑبڑ ہے"۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اس وقت تک دوسرا شہزادہ پستول نکال چکا تھا۔

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔ پستول نہ چلائیے گا"۔ فاروق نے

تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی کانپتا لرزتا اندھا دھند پیچھے
ہٹا اور دھڑام سے بے ہوش مینیجر پر گرا۔
"ارے ارے۔ کیا ہو گیا ہے بھئی" محمود نے گھبرا کر کہا اور
ایسے انداز میں فاروق کی طرف بڑھا جیسے اسے اُٹھانے کا ارادہ
ہو، لیکن پھر خود بھی اس کے اُوپر گر گیا۔
"اوہو۔ کیا مصیبت آگئی ہے۔ اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ"
شہزادہ گرجا۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی:
"کون ہے؟" ایک شہزادے نے چلّا کر کہا۔
"پولیس" باہر سے آواز آئی۔ آواز سن کر محمود اور فاروق
چونک اُٹھے۔ وہ ابھی تک مینیجر پر پڑے تھے۔ اور اُٹھنے کی کوشش
کے باوجود نہیں اُٹھ سکے تھے۔
"دروازہ کھول دو" ایک شہزادے نے دُوسرے سے کہا اور
وہ دروازے کی طرف مڑا۔
"اور تم سے اب تک اُٹھا نہیں گیا۔ فوراً اُٹھ کر کھڑے ہو
جاؤ۔ اندھو"
وہ صاف ستھری اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ اس پر محمود
اور فاروق کو حیرت ہوئی، لیکن یہ حیرت کے اظہار کا موقع
نہیں تھا۔ اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ انسپکٹر جمشید اور خان رحمان

[اند]ر داخل ہوئے:
"یہ کیا۔ کہا تو یہ گیا تھا کہ پولیس ہے دروازے پر" ایک شہزادے
نے بھنّا کر کہا۔
"ہاں! ٹھیک کہا گیا تھا۔ ہمارا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ اور
[یہ] کیا گڑبڑ ہو رہا ہے" انھوں نے گرے پڑے تینوں افراد کی
[ط]رف اشارہ کیا۔
"انھی کے لیے تو پولیس کو بلایا گیا تھا۔ آپ لوگ اتنی جلدی
[ک]س طرح آگئے" ایک شہزادہ چونکا۔
"ہم اتفاق سے اس وقت برآمدے میں موجود تھے، جب
آپ نے پولیس کا نعرہ لگایا تھا"
"اوہ اچھا" اس کے منہ سے نکلا۔
اسی وقت محمود اور فاروق اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مینیجر کے سر
سے خون بہہ رہا تھا:
"یہ دونوں چور معلوم ہوتے ہیں، پہلے سے کمرے میں چھپے
ہوئے تھے۔ جوں ہی مینیجر صاحب اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے
ان کے سر پر ڈنڈے برسا دیے۔ ہے کوئی تُک۔ اب آپ
انھیں لے جائیں۔ اور مینیجر صاحب کو ہسپتال بھجوائیں۔ ہم ان کی
[..]ی بعد میں پی لیں گے"
"ہوں! ٹھیک ہے۔ آؤ۔ جیل چل کر ان کے دال کا بھاؤ معلوم

ہوگا۔" خان رحمان نے پولیس والوں کے انداز میں کہا۔

انھوں نے انھیں بازو سے پکڑا اور باہر کی طرف لے چلے۔ محمود اور فاروق تو خود یہی چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے رُکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے انسپکٹر جمشید سمجھ گئے کہ وہ بھی یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ وُہ برامدے میں ہوتے لفٹ تک آئے۔ لفٹ فارغ تھی۔ اس میں داخل ہوتے ہی ہال کا بٹن دبا دیا۔ پھر جُوں ہی لفٹ رُکی۔ وہ اس سے نکل آئے اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔

اور جب وہ ہوٹل سے باہر نکل چکے تھے۔ اس وقت ہال میں ایک شور گونجا:

"ارے ارے۔ روکو انھیں۔ پکڑو انھیں۔ جانے نہ پائیں یہ بھی چوروں کے ساتھی ہیں۔"

لیکن جب تک بات بیروں کے پلّے پڑتی۔ وُہ جیپ میں سوار ہو چکے تھے اور جیپ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ کافی دُور نکل آنے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"یہ سب کیا ہے بھئی؟"

"کوئی بہت گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔" محمود بولا۔

"بہت گہرا ہو یا کم گہرا۔ فوراً تفصیل سُنا دو۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"خیر تو ہے۔ آپ بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں۔"

"تمھاری امّی اور فرزانہ گھر میں نہیں ہیں۔"

"کیا! ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں! ان کے ساتھ بھی ضرور کوئی چکر چلا ہے۔"

"ارے باپ رے۔ اس کا مطلب ہے۔ دونوں کامیاب نہیں ہو سکیں۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"ساری بات تفصیل سے ہی سنانا ہو گی، ورنہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔" محمود نے کہا اور تفصیل سُناتا چلا گیا۔

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ جال ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔"

"جی۔ جال۔ کیسا جال؟"

"سازش کا جال۔ کسی بہت گہری سازش کا جال۔ سب سے پہلے ہمیں فرزانہ اور تمھاری امّی کو تلاش کرنا ہو گا۔ ٹھہرو میں بھی اپنے حالات سُنا دوں۔ تاکہ ہم مل کر کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

اب انھوں نے واقعات سنائے۔ محمود، فاروق اور خان رحمان کی حیرت کا کیا پوچھنا:

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام کڑیاں ایک ہی معاملے کی ہوں۔" محمود بولا

"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہمیں فوراً جنوبی سڑک کا رخ کرنا ہو گا۔ اور اس وڈاٹنگ جانا ہو گا۔ ہو نہ ہو۔ باس اپنے ساتھیوں اور ہمارے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اب وہیں موجود ہے۔ اور شاید ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"اوہ۔ تب تو ہمیں پوری تیاری کے ساتھ جانا چاہیے۔" خان رحمان بولے۔

"نہیں خان رحمان۔ پوری تیاری میں وقت لگے گا۔ ہم اسی طرح چل پڑتے ہیں۔" انھوں نے کہا، پھر محمود اور فاروق کی طرف مڑے:

"تم نے اب تک ایک بات نہیں بتائی۔ اور وہ یہ کہ مینجر کو دیے جانے والے ہیروں کو اڑانے کی ضرورت کیوں محسوس کی تھی؟"

"وہ ہیرے ہمیں دوسرے ہیروں سے مختلف نظر آئے تھے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ بولے:

"خان رحمان۔ سٹیرنگ تم سنبھالو۔ میں ذرا ان ہیروں کا جائزہ لے لوں۔ پہاڑیوں تک پہنچنے میں ہمیں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔ یہ وقت ضائع کیوں ہو۔" یہ کہ کر انھوں نے جیپ روک لی۔ اور ان کے پاس آ بیٹھے۔ خان رحمان نے

ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ فاروق نے اپنی جیب سے ہیرے نکال کر ان کی طرف کر دیے۔ یہ کل چار تھے۔ انھوں نے ہاتھ میں لے کر ان کا وزن جانچا، پھر بولے:

"تمھارا خیال ٹھیک تھا بھئی۔ یہ ہیرے تو بالکل نقلی ہیں۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ نقلی ہیرے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! بالکل نقلی۔"

"لیکن ہم نے انھیں نقلی کے خیال سے نہیں اڑایا۔ ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہیروں کے ذریعے کوئی چکر چلایا جا رہا ہے، ورنہ ایسے شہزادے ہم نے کہیں نہیں دیکھے جو بات بات پر ہیرے لوگوں میں تقسیم کر دیں۔"

"خان رحمان۔ جیپ کو سڑک کے کنارے کر کے روک لو۔"

"کیوں۔ اب کیا ہوا؟" وہ بولے۔

"ایک پتھر کی ضرورت ہے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

خان رحمان نے بڑبڑا کر جیپ روک لی۔ وہ جلدی سے نیچے اتر آئے۔ عین اسی وقت پیچھے سے ایک کار انتہائی تیز رفتاری سے آتی دکھائی دی۔ انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ پھر چلا اٹھے:

"خبردار۔ لیٹ جاؤ۔ اور سڑک کے نیچے لڑھک جاؤ۔"

اُن کی آواز میں نہ جانے کیا تھا۔ ایک سیکنڈ بھی انھوں نے لیٹنے میں نہ لگایا۔ تڑ سے گرے اور لڑھکتے چلے گئے۔ ساتھ ہی تڑا تڑ کی آواز گونج اُٹھی۔ گولیوں کا پورا برسٹ مارا گیا تھا۔ اور پھر کار نظروں سے دُور ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اوجھل ہو گئی۔ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھے۔ جیپ کے ٹائر بال بال بچے تھے۔

"وہ۔ وہ ہیرے" فاروق ہکلایا۔

"ہیرے محفوظ ہیں۔ میں نے گرتے وقت مٹھی بھینچ لی تھی" انسپکٹر جمشید بولے۔

اب انھوں نے پھر پتھر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

"بھئی ذرا دھیان رکھنا۔ وہ کار پھر آسکتی ہے۔ اگر آتی نظر آئے تو دُور سے ہی اس پر گولیاں برسانا شروع کر دینا" وہ بولے۔

"جی بہتر۔ اب وہ بچ کر نہیں نکل سکے گی" محمود نے کہا ساتھ ہی اس نے اپنے والد کی جیب سے پستول نکال لیا۔ ادھر خان رحمان نے بھی پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

"وہ رہا پتھر" فاروق چہکا۔

"اور وہ رہی کار۔ وہ پھر آ رہی ہے" محمود چلّایا۔

"پتھر اور کار۔ بھئی واہ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا

ہے" فاروق بولا۔

"وقت تیرے لی۔ تمھیں ایسے میں ناولوں کے نام کی سوجھ رہی ہے۔ اور ادھر ہم پر گولیوں کی بارش ہونے والی ہے" محمود نے منہ بنایا۔

"اللہ مالک ہے" فاروق بولا۔

"ہمیں جیپ کو بھی بچانا ہے۔ اگر انھوں نے جیپ کو بے کار کر دیا تو ہمارا بہت وقت ضائع ہو گا" انسپکٹر جمشید چلّائے۔

انھوں نے جلدی جلدی درختوں کی اوٹ لے لی، پھر جوں ہی کار زد میں آئی، انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اچانک کار کے دونوں اگلے ٹائر پھٹ گئے۔ اور وہ اُلٹ گئی۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک چیخ کی آواز سُنی۔ کوئی شخص کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گرا اور ساکت ہو گیا۔

"خبردار۔ اس کے نزدیک نہ جانا۔ میں دیکھتا ہوں" انسپکٹر جمشید بولے اور رینگتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ گئے۔ چند سیکنڈ تک اس کا جائزہ لیتے رہے۔ آخر انھیں یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔ اب انھوں نے کار کا جائزہ لیا کار میں اور کوئی نہیں تھا۔

"آ جاؤ بھئی۔ یہ بے ہوش ہے"

یہ کہ کر وہ اس کے نزدیک ہو گئے۔ اس کے سر سے خون تیزی سے بہ رہا تھا۔ یہ چوٹ سر کے پچھلے حصے میں آئی تھی۔

"اب ہم کیا کریں؟"

"ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنا ہے، لیکن اس سے پہلے ان ہیروں کو توڑ کر دیکھیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

"یہ کام ہم بعد میں کیوں نہ کر لیں جمشید۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"نہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔ یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

فاروق پتھر اٹھا لایا۔ انھوں نے سڑک کے کنارے بیٹھ کر ہیروں پر پتھر برسانا شروع کیا۔ وہ کانچ کے معمولی ٹکڑوں کی طرح آسانی سے ٹوٹ گئے۔ ان چاروں میں تہ کیے ہوئے کاغذ موجود تھے۔ بہت باریک کاغذ۔ جب ان کی تہوں کو کھولا گیا تو وہ بہت بڑے سائز کے کاغذ نکلے اور ان چاروں پر انگریزی کے باریک حروف میں لمبی چوڑی تحریریں لکھی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر جمشید جیپ میں آ بیٹھے۔ اور جیپ کی لائٹ میں انھیں پڑھنا شروع کیا۔ خان رحمان اب جیپ چلا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے دیے جلتے چلے گئے۔

یہاں تک کہ انھوں نے ایک کاغذ کی تحریر مکمل پڑھ لی۔ پھر انھوں نے اسے تہ کیا اور باقی تین کاغذوں کے ساتھ جیب میں رکھ لیا۔

"کیوں ابا جان۔ باقی تین نہیں پڑھیں گے؟"

"نہیں۔ اندازہ ہو گیا ہے۔ سازش کیا ہے۔"

"اوہ۔ اور آپ ہمیں نہیں بتائیں گے؟"

"اب بتانے کا وقت نہیں رہا۔ ہم پہاڑیوں تک پہنچنے والے ہیں۔ ویسے اب مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ہماری لائبریری کو کیوں جلایا گیا ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"آپ ہماری بے چینی میں اضافہ کر رہے ہیں۔" محمود بولا۔

"اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ ایک منٹ بعد ہمیں جیپ سے اترنا ہو گا اور پہاڑیوں پر چڑھنا ہو گا۔ اور یہ کام اتنا آسان نہیں ہو گا، کیوں کہ پہاڑیوں پر دشمنوں کا قبضہ ہے۔"

"بہت اچھا۔ پہلے ہم دشمنوں سے دو دو ہاتھ کر لیں۔" فاروق بولا۔

"خان رحمان۔ شاید آج تم اسی مہم میں اسی لیے ساتھ ہو گئے ہو۔ کہ تمھاری ضرورت بھی تھی۔"

"چلو اچھا ہی ہے۔" وہ مسکرائے۔

اور پھر عین اسی جگہ پہنچ کر انھوں نے جیپ چھوڑ دی —
جہاں انسپکٹر جمشید پر ایک افریقی نے حملہ کیا تھا۔ ان کے پاس صرف دو پستول تھے۔ انھیں وڈاڈ تک پہنچنا تھا اور راستے میں بیس سے زائد دشمنوں کی طرف سے گولیاں برسائے جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے باوجود ان کے چہروں پر ایک شکن تک نہیں تھی؛ تاہم وہ پوری طرح ہوشیار اور محتاط تھے —

اچانک اوپر کی طرف سے ایک فائر ہوا۔ اور ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ یہ گویا جنگ کی ابتدا تھی —

اصلی حیرت

"جمشید! گولی ہمارے سروں پر سے گزری ہے۔ گویا انھیں [illegible]دازہ ہے کہ ہم اسی جگہ موجود ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں [illegible]ت میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرنا ہو گی۔ ورنہ ہم مار کھا [illegible]یں گے۔"

"ٹھیک ہے خان رحمان! اس چھوٹی سی فوج کی کمان اب [illegible]مارے ہاتھ میں ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"چھوٹی سی بھی اور نہتی بھی۔ یا پھر یوں کہ لیں کہ نصف [illegible]ی فوج — کیوں کہ چار آدمیوں کے پاس صرف دو پستول ہیں۔" [illegible]روق منمنایا۔

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی، تم یہ کیوں [illegible]ولتے ہو۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"اگر یہ بات میں نے بھلا دی ہوتی تو اس وقت تمھارے [illegible]ظ آگے نہ بڑھ رہا ہوتا۔" فاروق فوراً بولا۔

"اچھا خاموش - پہلے اپنے انکل کی ہدایات سن لو۔"

"ہدایات - لیکن جمشید - میں ہدایات کب دے رہا ہوں" خان رحمان نے گھبرا کر کہا۔

"ارے ! تو کیا بغیر ہدایات کے فوج کو آگے لے چلو گے" ان کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"اوہ - تو اس کا مطلب ہے - مجھے ہدایات دینا ہوں گی" وہ بڑبڑائے۔

اسی وقت اُوپر سے ایک ساتھ کئی فائر ہوئے:

"اب یہ ہمیں ڈرا رہے ہیں" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ ڈرنے والے ا آسمان نہیں ہم" فاروق گنگنایا۔

"یار خان رحمان - اس طرح تو یہ فوج آگے بڑھ چکی۔ کی آن میں ہدایات دو ، سمت بدلو اور آگے بڑھنا شروع کرو ورنہ ان کی باتیں تمھارے پیروں کی زنجیر بن جائیں گی اور تم کی ٹڈی دھری کی دھری رہ جائے گی۔"

"دُشش - شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو جمشید - یہ بات میں محسوس کر چکا ہوں" خان رحمان بولے۔

"شاید نہیں بھئی - میں یقیناً کہہ رہا ہوں" انسپکٹر جمشید بولے -

"اچھا تو بھئی - ذرا جلدی جلدی میری ہدایات سن لو" خان رحمان نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ فاروق بول اٹھا۔

"جلدی جلدی تو ہم جب سنیں گے نا جب آپ جلدی جلدی بیان کریں گے"

"تم پھر بولے" انسپکٹر جمشید نے بھنا کر کہا۔

"سنو بھئی" خان رحمان کی آواز رازدارانہ ہو گئی اور پھر وہ سرگوشی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ہدایات ختم ہو گئیں۔

اب انھوں نے رُخ بدلا اور آگے بڑھنے لگے - انھوں نے گولی چلانے کی کوشش نہیں کی تھی - گولی چلانے کا فائدہ بھی تو نہیں تھا - دشمن نظر تو آ نہیں رہے تھے -

پانچ منٹ تک وہ آگے بڑھتے رہے - دوسری طرف سے ابھی کوئی فائر نہ ہوا:

"شاید یار لوگ سو گئے ہیں" فاروق بولا۔

جوں ہی اس کا جملہ ختم ہوا - ایک گولی اس کے سر پر سے گزر گئی -

"ارے باپ رے - انھوں نے تو پھر ہماری سمت کا اندازہ لگا لیا" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"شاید تمھارے جملے کی گونج انھوں نے سن لی ہے" خان رحمان بولے -

"لیکن انکل - گونج سے سمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"ہوں ! یہ بھی ٹھیک ہے - خیر دیکھا جائے گا - بڑھے چلو۔" وہ بولے۔

گولیاں ان کے سروں پر سے گزرتی رہیں ، وہ آگے بڑھتے رہے ، پھر اچانک انسپکٹر جمشید کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی - کسی نے اوپر سے نعرہ لگایا :

"وہ مارا - یہ چیخ ضرور انسپکٹر جمشید کی تھی۔"

"لیکن ابھی اس کے تین ساتھی اور نیچے موجود ہیں - ان میں سے بھی کوئی بچ کر نہ جائے - اب چاروں طرف سے گولیاں برساؤ۔" کسی نے چیخ کر کہا۔

اب چاروں طرف سے گولیاں برسنے لگیں - چند منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ خان رحمان کے منہ سے ایک ہولناک چیخ نکلی -

"شاباش - تمہاری کارکردگی شاندار ہے - باس کے انعام کے حق دار ہو گئے ہو۔" اوپر سے پھر کہا گیا۔

اور گولیوں کی بارش ہونے لگی - اچانک محمود کی چیخ بلند ہوئی - اور دو منٹ بعد ہی فاروق کے حلق سے بھی چیخ نکلی -

"بس - اب اسلحہ ضائع نہ کرو - وہ چار تھے - چاروں ڈھیر ہو گئے۔"

"لیکن جب تک ہم ان کی لاشیں نہ تلاش کر لیں - اس وقت تک یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ چاروں مر چکے ہیں - یا ان میں سے کوئی زندہ بچ گیا ہے - یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی صرف زخمی ہوا ہو۔"

"ہوں ٹھیک ہے - نیچے اترو اور ان کی لاشوں کو تلاش کرو۔" اسی آواز نے حکم دیا۔

اور پھر پہاڑیاں قدموں کی آوازوں سے گونج اٹھیں - آدھ گھنٹے تک تلاش جاری رہی ، پھر اوپر سے آواز آئی :

"کیا ہوا بھئی - بہت دیر لگا دی۔"

"ابھی تک ہم انہیں تلاش نہیں کر سکے۔"

"کیا مطلب۔" اس نے چونک کر کہا۔

"واقعی حیرت کی بات ہے۔"

"تو کیا - تم ان میں سے کسی ایک کی لاش بھی تلاش نہیں کر سکے ؟"

"جی - نہیں !"

"اوہ - تب تو - تب تو -"

"تب تو کیا جناب ؟"

"تب تو یہ کر ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ تمھاری کمر سے جو چیز چھو رہی ہے۔ وہ پستول کی نالی ہے۔ اگر ذرا بھی حرکت کی تو گولی کمر کے پار ہو گی۔ اپنے ساتھیوں کو بھی حکم دو۔ اپنے اپنے پستول پھینک دیں اور ہاتھ اوپر اٹھا کر ادھر چلے آئیں۔" انسپکٹر جمشید کی آواز گونجی۔

چند لمحے کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ آخر ان کے آگے کھڑے ہوئے آدمی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"پستول گرا دو اور ہاتھ اٹھا کر اوپر چلے آؤ۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب۔ آپ باس کو کیا جواب دیں گے۔" نیچے سے کسی نے جھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"زندہ رہوں گا تو باس سے کچھ کہہ سکوں گا نا۔ اور اگر انسپکٹر جمشید کی گولی کا نشانہ بن گیا تو کیا کہہ سکوں گا۔ اس لیے جو کہہ رہا ہوں، کرو۔" اس نے گرج کر کہا۔

پستول گرنے کی آوازیں سنائی دیں اور پھر قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید کا ہاتھ حرکت میں آیا اور پستول کا دستہ پوری طاقت سے اس کے سر پر لگا۔ وہ چکرا کر گرا۔ محمود اس کے ہاتھ سے پستول پہلے ہی نکال چکا تھا۔ اس کے دھڑام سے گرنے کی آواز اس کے ساتھیوں نے بھی سن لی:

"کیا ہوا استاد۔ یہ آواز کیسی تھی؟"

"تمھارا استاد ذرا بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"اوہ! تب تو ہم ان کے حکم کی تعمیل نہیں کریں گے۔ دوستو۔ ان پر حملہ کر دو۔"

"خبردار!" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑو۔ یہ تم پر گولی نہیں چلائیں گے۔"

"تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ ہم کیوں گولیاں نہیں چلائیں گے۔ ذرا بتاؤ تو۔"

"تم بلاوجہ خون بہانے کے عادی نہیں ہو۔"

"لیکن اس وقت بہت بڑی وجہ ہمارے پاس ہے۔ اپنی جانیں بچانا۔ اور پھر تم لوگ ملک کے بدترین دشمن ہو۔ تمھارا خون بہانا تو عین ثواب ہے۔ چلو بھئی۔ شروع ہو جاؤ، جو زد میں آئے، اسے اڑا دو۔ یہ لوگ یوں نہیں مانیں گے۔" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

ان کے پستول گولیاں اگلنے لگے۔ جھاڑیوں میں جیسے بازار گرم ہو گیا۔ وہ لوگ اپنے پستول پھینک چکے تھے۔ اب ان کی تلاش میں ادھر ادھر ٹکریں مارنے لگے۔ انھیں جہاں بھی کسی جانے کا گمان ہوا، وہیں گولی داغ دی۔

آگ اور خون کا یہ کھیل آدھ گھنٹے تک جاری رہا، پھر خاموشی
چھا گئی - اب وہ وڈراڈ کی طرف بڑھے؛ تاہم ان کی نظریں
پیچھے بھی تھیں - یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کوئی دشمن زندہ ہو اور
ان کے پیچھے پہنچ جائے -

"آپ کے خیال میں امی جان اور فرزانہ کیا وڈراڈ میں ہوں
گی؟" محمود بولا۔

"ہاں! اور کہاں ہو سکتی ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے جواب
دیا، پھر بولے:

"نعمان رحمان! تم نے اپنی فوج کو بہت خوبی سے لڑایا -
واقعی تم ایک ماہر فوجی ہو۔"

"ہوں نہیں - بلکہ - تھا - اب تو ریٹائر ہو چکا۔"

"لیکن ہمارے نزدیک آپ ریٹائر نہیں ہیں انکل۔" فاروق
مسکرایا -

وڈراڈ کے نزدیک پہنچ کر انھوں نے احتیاط سے چاروں طرف
کا جائزہ لیا اور پھر پنسل ٹارچ کی روشنی وڈراڈ میں پھینکی - آس
پاس کوئی دشمن دکھائی نہ دیا - آخر وہ اللہ کا نام لے کر وڈراڈ
میں اتر گئے - دوسرا لمحہ مایوس کن تھا -

وڈراڈ بالکل خالی پڑی تھی - بیگم جمشید اور فرزانہ کا کہیں
پتا نہ تھا -

چند لمحے تک وہ خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف
دیکھتے رہے - آخر محمود بولا:

"اس کا مطلب ہے - وہ دونوں باس کے ٹھکانے پر
قید ہیں۔"

"ہاں! اب ہمیں وہیں جانا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"وہاں سے آپ کی کیا مراد - کیا آپ جانتے ہیں - باس
کون ہے؟"

"اندازہ ضرور ہے - جو غلط بھی ہو سکتا ہے - ویسے مجھے
اتنا یقین ضرور ہے کہ ہمارے گھر باس خود آیا تھا اور میں اکرام
کو ہدایات دے آیا تھا کہ انگلیوں کے نشانات اٹھوا لے -
اگر اس نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے تو ضرور وہ اس کی
انگلیوں کے نشانات حاصل کر چکا ہوگا - آؤ - شہر کی طرف چلتے
ہیں - فون کر کے معلوم کر لیں گے۔"

وہ نیچے اترنے لگے - آخر جیپ تک پہنچے - دوسرے ہی
لمحے وہ اڑے جا رہے تھے - پبلک فون بوتھ سے انھوں نے
اکرام کو فون کیا:

"ہیلو اکرام۔ کیا رپورٹ ہے؟"

"مجھے افسوس ہے سر۔ انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے۔"

"کوئی بات نہیں۔ جنوبی سڑک والی پہاڑیوں میں پندرہ میں دشمن زخمی یا مُردہ حالت میں پڑے ہیں۔ انھیں قبضے میں لے لو۔ میں ذرا ہوٹل انشاریہ کی طرف جا رہا ہوں۔"

"جی بہتر" اس نے کہا۔ ریسیور رکھ کر وہ پھر جیپ میں آ بیٹھے۔

"تو کیا آپ کے خیال میں ہوٹل انشاریہ کا مینجر مسٹر ڈوبام مجرم ہے؟"

"اس کے علاوہ اور کیا خیال قائم کیا جا سکتا ہے۔" وہ بولے۔

ہوٹل انشاریہ کی عمارت پوری طرح جگ مگا رہی تھی۔ گویا اس کا کاروبار معمول کے مطابق جاری تھا۔ انھوں نے جیپ دروازے کے سامنے روک دی اور آگے بڑھے۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر انھوں نے پوچھا:

"مسٹر ڈوبام سے ملنا ہے؟"

کلرک نے چونک کر ان کی طرف دیکھا:

"آپ۔ یعنی کہ آپ۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"ہاں بھئی۔ یہ میں ہی ہوں۔ تمھارے سامنے میرا بھوت

نہیں کھڑا۔ ڈوبام کہاں ہے؟"

"ج۔ جی۔ اپنے کمرے میں۔ میں انھیں اطلاع دیتا ہوں۔"

"نہیں۔ اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ میں بغیر اطلاع اس کے کمرے تک جانا چاہتا ہوں۔ محمود۔ چاقو نکالو۔" وہ بولے۔

"ج۔ جی۔ چاقو۔" کلرک خوف زدہ انداز میں بولا۔

"ڈرو نہیں۔ چاقو میں تمھارے جسم میں نہیں اتاروں گا۔" وہ مسکرائے۔

اتنی دیر میں محمود جوتے کی ایڑی میں سے چاقو نکال چکا تھا۔ انھوں نے چاقو ہاتھ میں لیا اور فون کے تار کاٹ دیے:

"خان رحمان! تم یہیں ٹھہرو۔ دو منٹ بعد مینجر کے کمرے میں آ جانا۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ بولے۔

"اگر کلرک صاحب کوئی حرکت کرنے کی کوشش کریں تو ان کے سر پر پستول کا دستا ٹھیک رہے گا۔" وہ بولے۔

"جی بہتر۔" انھوں نے کہا اور وہ محمود اور فاروق کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

لفٹ سے اتر کر وہ مینجر کے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ محمود نے انگلی سے دروازے پر دستک دی:

"کک۔ کون؟"

"در — دروازہ کھولیے جناب — میں ہوں:" انسپکٹر جمشید نے کڑک کی آواز حلق سے نکالی.

دروازہ فوراً ہی کھل گیا — وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئے —

"کیا مطلب؟" مینجر ڈوبام کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی.

"مطلب کس بات کا پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"ارے — یہ تو وہی ہیں:" افریقی شہزادے کی آواز سنائی دی —

"اوہ؟" مینجر ڈوبام کے منہ سے غصیلے انداز میں نکلا.

"انسپکٹر صاحب — یہ آپ کے بچے ہیں:" اس نے غرا کر کہا.

"جی ہاں ! اس میں کوئی شک نہیں:"

"لیکن یہ تو چور ہیں — انھوں نے نہ صرف مجھ پر ڈنڈوں سے حملہ کیا — بلکہ میری جیب سے چار ہیرے اڑا لیے، وہ ہیرے مجھے ان شہزادوں نے دیے تھے:"

"ہاں ! مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے — اسی لیے تو یہاں آیا ہوں:"

"تو پھر مہربانی فرما کر میرے ہیرے مجھے دے دیں:"

"میں ہیرے دینے کے لیے تیار ہوں ، لیکن پہلے آپ میرے چند سوالات کے جواب دینا ہوں گے:"

"ٹھیک ہے — پوچھیے — کیا بات ہے:"

"یہ شہزادے اب تک آپ کے کمرے میں کیوں موجود ہیں؟"

"آپ کو اعتراض کیوں ہے — یہ ہمارے ہوٹل کے مہمان ہیں، میں ان کی موجودگی میں زخمی کر دیا گیا تھا — ہمدردانہ طور پر ب تک میرے کمرے میں موجود ہیں:" اس نے منہ بنا کر کہا.

"بہت خوب — میرا دوسرا سوال — میری بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"

"جی کیا مطلب ؟"

"اس جملے میں کوئی مشکل لفظ تو ہے نہیں:" وہ بولے.

"میں کیا جانوں — وہ کہاں ہیں — یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے:"

"انھیں کچھ دیر پہلے گھر سے اغوا کیا گیا تھا:"

"تو پھر — اس کا مطلب تو نہیں کہ میں نے اغوا کیا ہے:"

"ہاں ! اس کا یہ مطلب نہیں ، لیکن یہ ایک عجیب بات ضرور ہے:" انسپکٹر جمشید مسکرائے.

"چلیے — وہ عجیب بات بھی بتا دیں:" اس نے جھلا کر کہا —

"ایک ماہ پہلے ہمارے شہر کے ایک تاجر روحی جنگ کے ہاں اور بگرامی نام کا آدمی مہمان آیا تھا — وہ انتقام میں رہائش پذیر ہے — ایک ماہ بعد وہ غائب ہو گیا — وہ کھانا انتقام ہوٹل ں کھاتا تھا:"

"تو پھر اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ اس مہمان کو میں نے غائب کیا تھا۔"

"ہاں! یہ تو واقعی ثابت نہیں ہوتا۔ خیر چھوڑیے۔ ایک اور شخص باقر رضا کے گھر میں ایک مہمان جہان شاہ آیا تھا۔ یہ مہمان ممباسا سے آیا تھا۔ یہ بھی ہوٹل انشارجہ میں کھانا کھانے آیا تھا۔ پندرہ دن پہلے یہ بھی غائب ہو گیا۔"

"تو پھر۔ میں کیا کروں۔"

"آج آپ کے ہوٹل میں دو افریقی شہزادے آئے۔ انھوں نے اپنے لباسوں میں ٹنکے ہیروں میں سے چار ہیرے توڑ کر آپ کو دیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! میں بھی تو انھی ہیروں کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کے یہ دونوں بیٹے ہی تو وہ ہیرے اڑا کر لے گئے ہیں۔"

"ہاں! یہ سچ ہے۔ چلیے اچھا ہوا۔ آپ نے اپنے منہ سے اقرار کر لیا۔ اب میں پھر آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی اور بچی کہاں ہیں؟"

"آپ نہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آخر میں کیسے سکتا ہوں یہ بات۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ بتا سکتے ہیں۔"

"آج میں اس الو کے پٹھے کو ضرور ملازمت سے نکال

دوں گا۔" ڈوبام نے تلملا کر کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ انداز خان رحمان کا تھا۔

"آ جاؤ خان رحمان۔ دروازہ کھلا ہے۔"

وہ اندر داخل ہوئے۔

"آپ کسے ملازمت سے نکالنے کی بات کر رہے تھے؟"

"کاؤنٹر کلرک کو۔ اس الو کے پٹھے نے مجھے آپ کے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔"

"ہاں واقعی۔ اگر وہ اطلاع دے دیتا تو آپ اپنے ان دونوں مہمانوں کو ادھر ادھر کر دیتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"مجھے ایسا کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔" اس نے جل بھن کر کہا۔

"آپ نے اب تک میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اور یہ بہت بری بات ہے۔"

"کون سی بات؟"

"بیوی اور بچی والی۔"

"میں نہیں جانتا۔ وہ کہاں ہیں۔"

"لیکن میرا دعویٰ ہے کہ آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اب میرا دماغ ضرور چل جائے گا۔"

"یہ پیش گوئی ہے یا صرف خیال"؟ محمود مسکرایا۔

"اُف - میں کیا کروں؟"

"اپنے باس کو آواز دیں - شاید وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں"
انسپکٹر جمشید بولے۔

"ب - باس - کیا مطلب؟"

"ایک تو آپ بات بے بات مطلب ضرور پوچھتے ہیں"
فاروق نے منہ بنایا۔

"میرا خیال ہے - ہم چلتے ہیں" ایک افریقی شہزادے نے
اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے - آپ اپنے کمروں میں آرام کریں" اس نے فوراً
کہا۔

دونوں اُٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔

"نہیں جناب - آپ لوگ ابھی نہیں جا سکتے - آپ کے بغیر
کیا مزا آئے گا"

"کیا مطلب" ان دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"آپ کا بھی اس معاملے سے پوری طرح تعلق ہے - ٹھہریے
میں آپ دونوں کی اُلجھن دُور کر ہی دوں - آپ کو اتنا زیادہ
اُلجھن میں رکھنا بھی ٹھیک نہیں - بات صرف یہ ہے کہ آپ
دونوں نے منیجر صاحب کو جو ہیرے دیے تھے نا - اور جو انھوں

نے اڑا لیے تھے، وہ دراصل بالکل مصنوعی ہیرے تھے"

"کیا!!" منیجر ڈوہام نے چلا کر کہا۔

"بلکہ ہیرے تو سرے سے تھے ہی نہیں - وہ تو کانچ کے
ٹکڑے تھے"

"نن - نہیں" ڈوہام اچھل کر بولا۔

"آپ اچھے ایکٹر نہیں ہیں جناب - مصنوعی حیرت کا اظہار
آپ کے چہرے پر صاف نظر آ رہا ہے - مہربانی فرما کر چہرے
پر اصلی حیرت لائیے - تاکہ ہمیں بھی کسی قدر یقین آ سکے"

"م - میں - میں" ڈوہام ہکلا کر رہ گیا - اس کے منہ سے
کوئی لفظ نہ نکل سکا - ادھر دونوں شہزادے جلدی جلدی ایک
دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے -

۹

چند لمحے تک موت کا سناٹا طاری رہا۔ آخر ڈوبام نے تھکی تھکی آواز میں کہا:

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ وہ ہیرے نہیں تھے۔ شیشے کے ٹکڑے تھے۔"

"خیر۔ آپ کو اس سے کیا۔" ایک افریقی شہزادے نے منہ بنایا۔

"واقعی مجھے کچھ نہ ہوتا، لیکن مشکل تو یہ آ پڑی کہ ان شیشے کے ٹکڑوں میں چار بڑے بڑے کاغذ بھی بند تھے۔ تہ در تہ کاغذ۔"

"نہیں!!" افریقی شہزادے ایک ساتھ چلائے۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"اور میں نے ان کی تحریریں بھی پڑھ لی ہیں۔"

ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

"محمود۔ دروازہ بند کر دو۔ کہیں یہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔"

"انکل پہلے ہی بند کر چکے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"ہوں۔ چوکس رہو۔ یہ فرار ہونے کی کوشش پھر بھی کریں گے۔"

"انسپکٹر جمشید۔ ہم سے سودا کر لیں۔"

"بہت خوب۔ مجھے کہہ رہے ہو۔ میں اپنے ملک کا سودا کر لوں۔"

"ہاں! تمہیں انشارہ میں ایک شان دار محل مل جائے گا۔ اس میں عیش سے رہنا۔"

"اور میرا ملک جائے بھاڑ میں۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا، پھر بولے:

"ویسے بہتر رہے گا۔ تم یہاں اپنے باس کو بھی بلا لو۔ اس صورت میں بہت لطف رہے گا۔"

"تت۔ تو تم یہ بات معلوم کر چکے ہو۔"

"ان تحریروں میں جب پوری تفصیل موجود ہے تو پھر میں کس طرح لاعلم رہ سکتا ہوں۔ اب دو ایک مزے کی باتیں سن لو۔ تم۔ مگر۔ نہیں۔ پہلے میں باس کو یہاں بلا لوں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید فون کی طرف بڑھ گئے۔ انھوں نے

کسی کے نمبر گھمائے۔ پھر ڈوبام کی آواز میں بولے:

"ہیلو باس۔ آپ کی یہاں فوری ضرورت ہے۔ ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔"

اتنا کہتے ہی انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر کچھ سوچ کر دفتر کے نمبر ملائے۔ اکرام کو خفیہ الفاظ میں چند ہدایات دیں۔ ریسیور رکھ کر ان کی طرف مڑے:

"اب ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ امید ہے۔ آپ محسوس نہیں کریں گے۔ خان رحمان تم ایک بار پھر نیچے جاؤ۔ اور کاؤنٹر کلرک کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی بھی آنے والا اگر مینجر کے بارے میں اس سے پوچھے تو وہ کوئی غلط بات نہ کر سکے۔ صرف اتنا بتا دے کہ مینجر صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔"

"اچھا! میں سمجھ گیا۔" انھوں نے کہا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

آخر بیس منٹ کے بعد ایک شخص کاؤنٹر پر پہنچا اور مینجر کے بارے میں پوچھا۔ خان رحمان کے ہاتھ میں پستول آ نکلا تھا، لیکن وہ اخبار کے نیچے چھپا ہوا تھا، چنانچہ اس نے کہا:

"اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔"

اور وہ اوپر چلا گیا۔ اس کے بعد بھی کچھ لوگ آئے

اور اسی طرح اوپر جاتے رہے۔ یہاں تک کہ اکرام اور چند سرکاری افسر بھی آ گئے۔ خان رحمان انھیں ساتھ لے کر خود اوپر پہنچ گئے:

"کیوں جمشید۔ سب لوگ پہنچ گئے یا کچھ رہ گئے ہیں؟"

"نہیں خان رحمان۔ بس تم رہ گئے تھے۔" وہ بولے۔

کمرے کا دروازہ ایک بار پھر بند کر لیا گیا۔ اب کمرہ لوگوں سے بھر چکا تھا۔ آخر آئی جی صاحب کی آواز اُبھری:

"یہ سب کیا ہے جمشید؟"

"بہت اہم معاملہ ہے سر۔ میں پہلے آپ سب کو پوری تفصیل سنا دوں۔ کیس سے متعلق سبھی لوگ اب یہاں موجود ہیں، لیکن سب کو سب حالات معلوم نہیں۔ لہٰذا سنیے:"

یہ کہہ کر وہ ہر بات تفصیل سے بتاتے چلے گئے۔ آخر اس وقت تک جو کچھ ہوا تھا بتانے کے بعد خاموش ہو گئے۔ کمرے میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ان سب کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے، کیوں کہ اصل راز کی باتیں اب سامنے آنے والی تھیں۔ آخر انسپکٹر جمشید کے ہونٹ ہلے:

"اب میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اصل چکر کیا ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک کی طرح ہمارے ملک میں بھی اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک وسیع پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔ اس پروگرام پر گویا ابھی عمل شروع ہی کیا گیا ہے۔ اور اگر ہم یہ سازش

دیکھا جاتا تو چند ماہ کے اندر گڑبڑ شروع ہونے والی تھی۔
ایسی گڑبڑ دراصل پہلے اندر سے شروع کی جاتی ہے۔ فساد
جنگی اور آپس میں نفرت پھیلائی جاتی ہے — اور پھر اچانک
دشمن ملک کی فوجوں کے لیے راستے کھول دیے جاتے ہیں۔
وہ بغیر کسی جنگی رکاوٹ کا سامنا کیے ملک میں چھا جاتے
ہیں۔ اس پروگرام کو شروع کرنے کی غرض سے پہلے یہاں
وہ مہمان آئے۔ انھیں ہدایات دی گئی تھیں کہ ہوٹل انشاریہ
کے منیجر سے رابطہ قائم کریں۔ جو ظاہر میں تو انشاریہ کا آدمی
ہے۔ لیکن ہے وشاس کا — جب ان کی ملاقات ہو گئی۔
تفصیلات طے ہو گئیں تو چپ چاپ انھیں واپس بھیج دیا گیا
اور اس کے بعد اصل کام شروع ہوا۔ سارا کام جنوبی افریقہ
کے لوگوں سے لیا جانا تھا؛ چنانچہ ان کو ملک میں داخل کیا
گیا۔ اور دہشت ناک قسم کے ہتھیار انھیں دے دیے گئے،
پھر پروگرام کی تفصیلات یہاں کے انچارج کو بھیجی گئیں۔ آج
کے پروگرام میں وہ تفصیلات ہی منیجر کو دی گئی تھیں۔ منیجر
یہ ہدایات اصل باس تک پہنچاتا۔ لیکن محمود اور فاروق نے ان
سے پہلے ان ہدایات کو اڑا لیا۔ تفصیل میں پہلے ہی بتا چکا
ہوں۔ جہاں انھوں نے یہ پروگرام شروع کیا، وہاں انھوں
نے میرے گھرانے کا بھی صفایا کرنے کا پروگرام بنایا، کیوں

انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھ سے لوگوں کے ہوتے ان
کی سازش پروان نہیں چڑھ سکے گی؛ چنانچہ یہ لوگ میری
گھات میں لگ گئے۔ میری لائبریری کو جلا ڈالا، کیوں کہ اس
میں اس قسم کی سازشوں کے امکانات پر ایک بہت ضخیم
کتاب موجود تھی۔ وہ کتاب میرے ایک دوست نے مجھے
دی تھی۔ اور اگر وہ مجھے وہ کتاب نہ دیتا۔ تو اسے میری
لائبریری بھی نہ جلانا پڑتی۔ جس زمانے میں اس نے کتاب
مجھے دی تھی، اس زمانے میں اس کے وہم و گمان میں بھی
نہیں تھا کہ ہمارا دشمن ملک اس کام کا انچارج ہی اسے بنائے
گا، ورنہ وہ مجھے اس کتاب کی ہوا بھی نہ لگنے دیتا۔ بہرحال
اب جب کہ اسے انچارج بنا دیا گیا تو اسے اس کتاب کا خیال
آیا۔ اس نے سوچا۔ پوری لائبریری کو ہی جلا دیا جائے —
تاکہ یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ کس کتاب کے لیے لائبریری کو
جلایا گیا ہے۔ باس کو ڈر تھا کہ کہیں میں اس کے راز سے
پردہ نہ اٹھا دوں۔ اس لیے اس نے کئی رخ سے وار کیا —
لائبریری جلا دی۔ بیوی اور بچی کو اغوا کر لیا اور مجھے بھی
ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن [illegible] — [illegible]
منظور نہیں تھا۔ اس لیے وہ بری طرح ناکام رہا۔ اگر اسے
کامیابی ہو جاتی تو پھر وہ فوری اور بڑے پیمانے پر [illegible] شروع

کر دیتا۔ پہلے نمبر پر ملک کے اندر مختلف جگہوں پر خون ریزی
لوگوں کی پر اسرار اموات۔ اکثر جگہوں پر لوگ غائب ہوتے
ان کے کپڑے ڈھیر کی صورت میں ملتے اور ان کے جسم غائب
ہوتے۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل جاتا۔ کہ لوگ کہاں
غائب ہو رہے ہیں۔ کون انھیں غائب کر رہا ہے۔ حکومت کو
طعنے دیے جاتے۔ حکومت کی ناکامی کا زور شور سے چرچا کیا
یہاں تک کہ لوگ حکومت سے بدظن ہونے لگتے۔ ان حالات
میں کوئی ایسا آدمی اٹھ کر منظر عام پر آتا۔ جو ہنگامے کر
والوں کو اور اکساتا۔ اس طرح ہنگاموں کی لہر اور تیز ہو جاتی
اور پھر یہ کسی کے روکے نہ رکتے۔ پھر کچھ غدار لوگ یہ
کرتے نظر آتے۔ پڑوسی ملک کو چاہیے۔ ہمارے ملک
انتظام سنبھال لے۔ اس حکومت سے تو ملک نہیں چل رہا
آواز خوب زور شور سے اٹھائی جاتی۔ اور پھر ایک
دشمن ملک دندناتا ہوا ہمارے ملک میں آ گھستا۔ یہ تھا
لیکن اللہ کا ہم پر بڑا کرم ہے کہ اس نے اسے ابتدائی
ہی روک دیا۔"

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ سب
ٹکر ٹکر انھیں دیکھ رہے تھے۔

"لیکن آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ پروگرام کا انچارج

باس کون ہے؟"

"یہاں موجود تمام لوگوں میں سے کوئی ایک ضرور باس ہے، اور اسی کے گھر میں میری بیوی اور بچی قید ہے۔ اب یا تو سب لوگوں کے گھروں کی تلاشی لی جائے۔ یا پھر میں یہاں ہی اعلان کر دوں کہ میرے خیال میں باس کون ہے۔"

"یہیں اعلان کر دیں۔ اس طرح تو بہت دیر لگے گی۔" ایک افسر نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"ایک منٹ ابا جان۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مسٹر رومی جنگ اور باقر رضا کے مہمانوں کو چپ چپاتے کیوں واپس روانہ کر دیا گیا۔ وہ اپنے میزبانوں کو بتا کر بھی تو واپس جا سکتے تھے؟"

"بھئی ملک میں لوگوں کے غائب ہونے کا واویلا تو مچانا ہی تھا۔ ان دونوں سے گویا ابتدا کر دی گئی تھی۔ ادھر سے ان کی بیویاں مسٹر رومی جنگ اور باقر رضا صاحب سے اپنے شوہروں کے بارے میں بار بار معلوم کر رہی تھیں۔ تاکہ انھیں ان کی گم شدگی کا یقین ہو۔ اس کے بعد بھی تو آخر گم ہونے کا چکر چلا تھا۔ انھوں نے سوچا۔ پہلے ہی کیوں نہ شروع ہو جائے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بات سمجھ میں آ گئی۔ اب آپ مہربانی فرما کر باس کو

نام بتا دیں۔ کیوں کہ مارے بے چینی کے ہمارا بہت بُرا حال
ہے۔ اور پھر ہمیں وہاں سے جا کر امی جان اور فرزانہ کو بھی
لانا ہے۔ وہ بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ ہم انھیں بھول ہی
گئے۔"

"نہیں۔ بھولے نہیں۔ تمہارے انکل انھیں یہاں لے
آئے ہیں۔ اور وہ دروازے سے باہر بیٹھی یہ ساری تفصیل سن
رہی ہیں۔"

"ارے!" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ فرزانہ تم تو اندر آ ہی جاؤ۔ تاکہ انھیں پوری طرح
یقین آ جائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

دروازہ کھلا اور فرزانہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔
محمود اور فاروق نے کمرے میں موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ ایک
چہرہ انھیں بالکل تاریک نظر آیا۔

"یہ صاحب کچھ زیادہ ہی فکر مند دکھائی دے رہے ہیں
جان۔ کہیں یہی تو باس نہیں ہیں؟"

"ہاں! فکر مند نہ ہوں تو کیا کریں۔ فرزانہ اور تمہاری امی
اپنے گھر میں قید کر کے انھوں نے خیال کیا تھا کہ میرا خیال
تک جا ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ اس صورت میں تو شاید ممکن
اگر انھوں نے مجھے وہ کتاب نہ دی ہوتی۔ اب جب کہ

مجھے وہ کتاب دی تھی اور میری لائبریری جلی ہوئی پائی گئی۔ ادھر
ں نے ان چار تحریروں کی صورت میں ان کا سارا منصوبہ پڑھ
تو مجھے اس کتاب کا خیال کیوں نہ آتا۔ اور جب کتاب کا
ال آ گیا تو پھر کتاب دینے والے کا خیال کیوں نہ آتا۔ دراصل
وہی ماسٹر ہیں۔ جن سے میں باس کے ہتھیار کے بارے میں
لوم کرنے گیا تھا۔"

"ارے!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ مارے حیرت کے
ان سب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مجرم کا چہرہ اب پہلے سے کہیں
یادہ تاریک ہو چکا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر گڑی تھیں اور
وں لگتا تھا جیسے اب وہ کبھی سر نہیں اٹھا سکے گا۔

"لیکن ابا جان۔ اتنی بڑی سازش اور یہ شخص اس کا انچارج؟"

"تم اسے کیا سمجھتے ہو۔ یہ دُنیا کی بے شمار زبانوں کا ماہر
۔ حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ بہترین نشانے باز
۔ اور غیر ملکی جاسوس بننے کے لیے یہ ہر طرح فٹ ہے۔
ر جب کوئی بہت بڑی پیش کش کی جائے تو ایسے آدمی
وراً مان جاتے ہیں۔ ظاہر ہے، اس سے کہا گیا ہوگا کہ دشمن
یں ایک شان دار محل رہنے کے لیے ملے گا۔ اور تمام ضروریات
ی دی جائیں گی۔ کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔
عیش کرنا ہی کام ہوگا۔"

"خیر۔ عیش تو اب انہیں جیل میں بھی ملے گی ۔ وہاں بھی تو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ بس چکی پیس لی ۔ ہاں بانٹ پیے رہ گئی محل کی بات ۔ تو یہ اپنی کوٹھڑی کو محل خیال کر سکتا ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں" فاروق نے روانی کے عالم میں کہا اور کمرے میں موجود لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں ۔

خاموش ہتھیار

کا انعامی سوال

سوال : آخری باب کا عنوان تجویز کریں ؟

- ۲۵۰ روپے پانچ بہترین عنوانات پر برابر تقسیم کیے جائیں گے ۔
- اپنے جوابات بالکل الگ کاغذ پر لکھیے ۔
- ہر کاغذ پر نام پتا ضرور ہونا چاہیے ۔
- کاپی سائز کاغذ استعمال کریں ۔
- جوابات ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک وصول کیے جاتے ہیں ۔

(ادارہ)

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۴۴

مارکوش تین

مصنف: اشتیاق احمد

- عارف کریمی کا چہرہ یک لخت سیاہ پڑ گیا۔
- یہ بات فرزانہ نے نوٹ کی تھی۔
- انسپکٹر جمشید کو کسی نے ڈوگی کے نام سے پکارا۔
- بیگم جمشید اس بار انوکھے روپ میں۔
- خان رحمان اور پروفیسر داؤد ان کے ہاں۔ لیکن
- انہیں کس نے فون کیا تھا۔

ہر قدم پر نئے ہنگامے۔

قیمت: چھ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۴۵

بڑا مارکوش

مصنف: اشتیاق احمد

- بڑا مارکوش آخر کیا چاہتا تھا۔
- وہ پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ میں کیا کر رہا تھا۔
- انسپکٹر جمشید اور بڑے مارکوش کی زبردست ٹکر۔
- وہ منظر جب بچیاں الٹی لٹک رہی تھیں۔
- پروفیسر داؤد کی بے مثال جرأت۔
- اس ناول میں صدر مملکت بھی کردار ادا کر رہے ہیں۔ آپ مسکرائے بغیر نہیں رہیں گے۔

قیمت: چھ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

آفتاب، آصف، فرحت اور انسپکٹر کامران مرزا سیریز ۵۴

مارکوش وار

مصنف: اشتیاق احمد

- انسپکٹر کامران مرزا سے ملاقات کے لیے ایک پُر اسرار آدمی کی آمد —
- ریاست پالان میں کیا ہو رہا تھا —
- وہ ملک میں رہنے پر مجبور تھے۔ لیکن انھیں ریاست پالان بھی جانا تھا —
- اس اُلجھن کا حل انسپکٹر کامران مرزا نے کیا سوچا —
- بڑا مارکوش انسپکٹر کامران مرزا سے کس انداز میں ٹکرایا —
- آفتاب، آصف اور فرحت نے مارکوشوں سے مقابلہ کس انداز سے کیا —
- قدم قدم پر سنسنی جگاتا ناول —

قیمت: چھے روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

شوکی سیریز ۳۶

مارکوش کی چال

مصنف: اشتیاق احمد

- شوکی برادرز سے مارکوشوں کی ٹکر —
- قدم قدم پر قہقہے —
- زبردست طاقت کے مالک بڑے مارکوش سے شوکی نے کیسے مقابلہ کیا —
- پروفیسر عقلان کی تجربہ گاہ میں ایک خوفناک ہنگامہ —
- مشترکہ مجرم کی اس سیریز کا انجام کیا ہوا —

قیمت: چھے روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

انسپکٹر ارسلان سیریز نمبر ۹

ہولناک منصوبہ

مصنف: آفتاب احمد

- اسلامی ملک رہبودیہ کے صدر کو ایک خوفناک اطلاع ملتی ہے —
- پاک لینڈ کے صدر کو فوری طور پر رہبودیہ بلایا جاتا ہے —
- بابر، توقیر، رفعت، کاشف اور طارق کو ایک خوفناک جنگ لڑنا پڑتی ہے
- انسپکٹر ارسلان کا ایک انوکھے اور خطرناک دشمن سے مقابلہ —
- دشمن ان کے مقابلے پر صفر کے برابر تھا، مگر —
- زندگی میں پہلی مرتبہ ایک وقت ایسا ان پر آیا کہ انھیں اپنے اور جان محمد سے مقابلہ کرنا پڑا — کیوں؟
- پورا عالم اسلام خوف کی لپیٹ میں تھا —
- ایک بہادر دشمن سے ملاقات —

قیمت: چھ روپے

چاٹ کا چکر

کا انعام

سوال یہ تھا: پورے ناول میں سے ایک جملہ منتخب کریں۔ جن پہلے پانچ قارئین کا جملہ اشتیاق احمد کے منتخب کردہ جملے سے مل گیا، وہ انعام کے حق دار ہوں گے۔

جملہ یہ تھا: ہم صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ کے حضور پہنچ جائیں گے۔

انعام پانے والوں کے نام پتے درج ذیل ہیں:

- اقبال بٹ، پلیر جی روڈ، مکان نمبر ۲، ریلوے کالونی، جی ٹی روڈ، لاہور
- نور علی عابد، رول نمبر ۱، جماعت نہم ڈی، گورنمنٹ ایم۔ بی۔ ہائی سکول جھنگ صدر —
- فیصل محمود، معرفت بابر برادرز، مین مارکیٹ، ماڈل ٹاؤن، گوجرانوالہ
- ناصر فہیم، مکان نمبر ایل۔ ٹو ۱۳۳، سعود آباد کراچی ۲۵
- عبدالرحمن ۱۰-۲۰-ڈی، پلاٹ نمبر ۱۲، پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵ —

- آپ صرف ایک روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے تحریک ختم نبوت کے ممبر بن سکتے ہیں۔
- یہ تحریک وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔
- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔
- اس تحریک میں شامل ہو کر سچے مسلمان ہونے کا ثبوت دیں۔
- اشتیاق احمد بھی ممبر ہیں۔
- اپنے کوائف اور ڈاک ٹکٹ مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں:

مرکزی دفتر مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت، حضوری باغ، ملتان

مبشر نذیر، جہلم

: شوکی برادرز کا پہلا ناول کون سا تھا، تو آپ نے کس کی فرمائش پر لکھا؟

جگر: نیا کارنامہ۔ آپ لوگوں کی فرمائش پر ہی لکھا تھا۔

نعیم الدین خان، لاہور

: آپ کے کتنے بچے ہیں؟

جگر: سات۔

پرنس عاصم الرحمٰن، کراچی

: آپ کے سبھی کردار سر پھرے ہیں، کوئی ایسا بھی ہے جس کا سر نہ پھرا ہو؟

جگر: آپ کو سر پھرے ہونے پر اعتراض ہے کیا!

صدف جبیں، کراچی

: آپ کو اپنے کرداروں کے علاوہ اور کس مصنف کا کون سا کردار پسند ہے؟

جگر: ابن صفی کے سبھی کردار پسند ہیں۔

سید محمد جعفر رضوی، لاہور

: آپ کے پاس کتنی کاریں ہیں؟

جگر: ایک سے زائد کار فضول خرچی ہے اور اسلام اس کی اجازت

نہیں دیتا۔

فیاض احمد ، پتوکی

س: پہلا دھماکا کب شائع ہو رہا ہے؟

ج: ۲۰ مارچ کو۔

فیاض محمود خاکوانی ، بہاولنگر

س: آپ کو ناول کا عنوان لکھتے وقت پریشانی ہوتی ہے یا دو باتیں لکھتے وقت؟

ج: پریشانی ہونا ضروری ہے، ہر موقعے پر ہو سکتی ہے اور کسی موقعے پر بھی نہیں ہو سکتی۔

سرور ایوب ، راولپنڈی کینٹ

س: اگر آپ کا پرائز بانڈ نکل آئے اور آپ لاکھوں کے مالک بن جائیں تو کیا ناول لکھنا چھوڑ دیں گے؟

ج: نہیں نکلے گا، کیوں کہ خریدا ہی نہیں۔

عامر اکرم ، کراچی

س: اگر کوئی غیر ملکی جاسوس آپ کے گھر آ کر کہے کہ ناول لکھنا چھوڑ دو، تو کیا کریں گے؟

ج: اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا، کیوں کہ وہ مجھے بھوکا مارنا چاہتا ہے۔

جاوید اقبال ، عامر ڈار، سیالکوٹ

س: یہ آپ مجرموں کی اتنی ورائٹی کہاں سے لے آتے ہیں؟

ج: کہیں سے بھی نہیں، خود ہی آ جاتی ہے۔

ظفر اقبال ، بشیر قادری، پنڈی گھیب

س: دارا کا مرجان لکھتے وقت آپ نے حقیقت کو پیش نظر رکھا تھا یا اتفاقیہ طور پر ناول حقیقت سے ملاپ کھا گیا؟

ج: اتفاقیہ طور پر۔

فواد حیدر ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

س: آپ کا پسندیدہ تاریخی ناول نگار کون ہے؟

ج: نسیم حجازی۔

حمید الرحمٰن ، امرپورہ ، راولپنڈی

س: آپ نے پانی پت میں کتنی جنگیں لڑی ہیں؟

ج: میں اس وقت جنگ لڑنے کے قابل نہیں تھا۔

فتح محمد ، راولپنڈی

س: آپ کی اور آنٹی کی کبھی لڑائی ہوتی ہے؟

ج: اکثر۔

حاجی محمد ارجمند، سندھو

س: آپ خود کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور تصوف بھی کرتے ہیں۔ تو کیا آپ انکم ٹیکس دیتے ہیں؟ صحیح آمدن ظاہر کرتے ہیں؟ وضاحت کریں۔

ج: آپ کا تعلق انکم ٹیکس سے ہے کیا۔ مطمئن رہیں۔ میں ٹیکس ادا کرتا ہوں۔

جمال ناصر ، نیو کراچی

س: کیا آپ نے آنٹی کے مشورے سے ناول لکھنا شروع کیے تھے؟

ج: جب ناول لکھنا شروع کیے تھے۔ اس وقت آپ کی آنٹی بیاہ کر نہیں آئی تھیں۔

محمد اکرم، شاہراہ لیاقت کراچی

س: انکل! آپ کی جگہ میں لے لوں تو؟

ج: یہ کام آفتاب احمد پہلے ہی کر چکے ہیں۔ آپ اب ان کی جگہ کی فکر کریں، ادھر زید پر تول رہا ہے۔

تحسین اختر، کراچی

س: اگر آپ کو ایک دن کے لیے حکومت مل جائے تو؟

ج: مرزائیوں کو ملک سے باہر نکال دوں گا۔

سید منور سعید، گلشن اقبال کراچی

س: اب آپ غلطیاں بہت کرنے لگے ہیں، اس کی وجہ؟

ج: مثلاً۔

عبدالمتین، فیڈرل بی ایریا، کراچی

س: آپ نے بچوں کے علاوہ بڑوں کے بھی ناول لکھے ہیں۔ ان کی تعداد کتنی ہے؟

ج: پانچ چھے ہوں گے۔

عظمیٰ صدیق، سرگودھا

س: اگر آپ ابھی مر جائیں تو ہمارا کیا بنے گا؟

ج: کچھ بھی نہیں، آپ کسی اور کو پڑھنے لگیں گے۔

احتشام شیخ، راولپنڈی

س: ڈیر اشتیاق! ایسا کیوں ہے کہ جب ہم خود بزدل ہوتے ہیں تو بڑے بڑے باہمت ہیرو تراش لیتے ہیں؟

ج: انسان کے پاس جس چیز کی کمی ہوتی ہے، وہ تصور میں

اسی کو تراشتا ہے۔

آصف ندیم، جہلم

س: آپ کی شادی کس سن میں ہوئی؟ بچے کتنے ہیں؟

ج: اپریل ۷۶ء میں۔ سات بچے ہیں ماشاءاللہ۔

عزیز سیف الدین، کراچی

س: آپ کے ناولوں میں اب پہلے جیسی بات نہیں رہی؟

ج: یہ تو اچھی بات ہے۔

سید عدنان حسن، کراچی

س: آپ کے ناول لکھنے کا اصل مقصد کیا ہے؟

ج: آپ ناول پڑھ کر اندازہ لگائیں۔

ریاض احمد شیخ، روہڑی

س: شاید آپ کی زندگی کا مقصد ہم سے پیسے بٹورنا ہے؟

ج: آپ مجھے پیسے بٹورنے کیوں دیتے ہیں۔

محمد اسلم قمر، کراچی

س: تینوں سیریز میں آپ کو کون کون سے ناول پسند ہیں؟

ج: سبھی پسند ہیں۔

فرحت واحد علی، لطیف آباد

س: پہلے آپ فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، اب بیرسٹر ہو۔ پہلے کیا محسوس ہوتا تھا اور اب کیا محسوس ہوتا ہے، اس وقت زیادہ مزہ آتا تھا، یا اب؟

ج: اس وقت وہ اچھا نہیں لگتا

تھا، لیکن آج وہی کھانا یاد
آ آتا ہے — اور منگوا کر کھاتا
ہوں۔

سرمد ایوب، راولپنڈی
س: کیا آپ کے نواسے کے بچے
بھی ناول پڑھتے ہیں، پوچھ
کر بتائیے؟
ج: لیکن آپ یہ کیوں پوچھنا چاہتے
ہیں۔ پہلے یہ تو وضاحت کریں۔

ابو ظفر، کراچی ۴۴
س: آپ کون سی گھڑی پہنتے
ہیں؟
ج: میرے پاس ریکو ہے۔

مقبول احمد، کورنگی روڈ، کراچی
س: کیا آپ نے سلسلہ اشتیاق
کے کاری اس لیے شروع کیا
ہے کہ آپ کے پاس ناموں
کی کمی واقع ہو گئی ہے اور
آپ اپنے قارئین کے نام
ناولوں میں رکھ سکیں؟
ج: کیا میں نے اس طرح کچھ نام
ناولوں میں لیے ہیں!

ناہید شاہین، بسیلہ
س: انکل، آفتاب بھائی کے
بچوں کو ناول پڑھنے کا شوق
ہے یا لکھنے کا؟
ج: ابھی ان کے بچے ہی نہیں
ہیں۔

احتشام احمد، گوجرانوالہ
س: ایسا وقت، جب آپ کو
زبردست غصہ آیا — آپ نے
اس وقت کیا کیا؟
ج: یہی مجھ میں خرابی ہے، مجھے

کو پینا بھول جاتا ہوں۔

پرنس افضل شاہین، بہاول نگر
س: پیارے چچا! کیا آپ کبھی
بچوں کے ماہنامے جگنو سے بھی
منسلک رہے ہیں؟
ج: جی ہاں! میں اس کا ایڈیٹر
رہا ہوں۔

بشریٰ نذیر، جہلم
س: سُرخ تیر والے سلسلے کے
آخری ناول کا نام کیا ہے؟
ج: سُرخ تیر کی وادی میں۔

محمد عمران پرویز، سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی
س: اگر آپ کے بیٹے نوید نے
آپ کی جگہ کام کرنا پسند کیا
تو کیا آپ ریٹائر ہو جائیں
گے؟
ج: تو اور کیا کر سکتا ہوں۔

محمد نوید مرزا، لاہور
س: آپ کی کوئی ایسی خواہش
ہے جو پوری نہ ہوئی ہو؟
ج: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر
خواہش پہ دم نکلے — لیکن
سب سے بڑی خواہش یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو
معاف کر دیں — اور جہنم سے
نجات دے دیں — اب اس
خواہش کے پورا ہونے اور
نہ ہونے کے بارے میں، میں
مرنے سے پہلے کس طرح بتا
سکتا ہوں — ہاں مرنے کے بعد
ممکن ہے — کسی کے خواب میں
آ کر بتا دوں۔

سید محمد جعفر رضوی، ملتان روڈ، لاہور

س: آفتاب احمد کی تعلیم اور عمر کیا ہے؟ کیا یہ کہیں نوکری وغیرہ بھی کرتے ہیں؟

ج: ایف۔اے ہیں، نوکری نہیں کرتے۔

محمد محبوب اختر، راولپنڈی

س: آفتاب احمد کی زندگی کا سب سے پہلا ناول کون سا ہے؟

ج: سُرخ لفافہ۔

مجتبیٰ علی خان، کراچی ۲۹

س: کیا آپ وادیٔ مرجان سے بہتر بھی ناول نہیں لکھ سکیں گے؟

ج: کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مہربان اعظم، ڈیرہ اسماعیل خان

س: آپ نے پہلے بچوں کا ایک رسالہ نکالنے کا وعدہ کیا تھا، وہ وعدہ کیا ہوا؟

ج: اپنی مصروفیات کا جائزہ لینے کے بعد ارادہ ختم کر دیا۔

علی نذیر، لیاقت آباد کراچی

س: کیا یہ آپ کے ماں باپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ آپ آج اس مقام پر ہیں؟

ج: جی ہاں! ماں باپ کی دعائیں بہت اثر رکھتی ہیں۔

محمد فیصل، گلشن اقبال کراچی

س: آپ کو مصنف بننے کا خیال کیسے آیا؟

ج: آیا نہیں، دلایا گیا۔

معراج یاسین، ڈیرہ اسماعیل خان

س: آپ اپنی سوانح حیات کب

لکھ رہے ہیں؟

ج: اور میری کہانی کیا ہے۔

فقیر محمد، گودآباد، کراچی

س: آپ اپنے نام کے ساتھ حاجی لکھنا کیوں پسند نہیں کرتے؟

ج: حج فرض ہے۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ۔ اس طرح تو ایک نمازی آدمی کو بھی یہ کہلانا چاہیے، نمازی غفور احمد۔

عاصم شہزاد، موچی گیٹ لاہور

س: آپ نے اشفاق احمد کے لمبے قد کا ذکر تو کئی بار کیا، کبھی شوکی کے چھوٹے قد کا ذکر بھی کر دیں؟

ج: بہت بہتر۔ ویسے میرا خیال ہے۔ ذکر آتا رہتا ہے۔

ندیم احمد، فیڈرل بی ایریا، کراچی

س: بیسٹ والا اور ملکان ریچھ نما آدمی، اب تک کسی خاص نمبر میں کیوں نہیں آئے؟

ج: ضروری تو نہیں کہ ہر مجرم خاص نمبر میں آئے۔

محمد عادل منہاج، کراچی

س: آپ ہم سے کاغذ کی قیمت وصول کرتے ہیں یا کہانی کی؟

ج: آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

فیصل نظامی، ناظم آباد کراچی

س: کیا آپ کو کیڑے مکوڑوں سے بہت دلچسپی ہے کہ ہر خاص نمبر میں سُرخ چیونٹیوں اور سیاہ مکوڑوں کو لے آتے ہیں؟

ج: یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔